پ ﭙ ﭘ ﭗ

الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی النبی محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین اما بعد۔

علم نبوت بنی نوع انسان کے لئے ایک ایسی نعمت ہے کہ اللہ رب العالمین نے اس کی حفاظت اپنے ذمے لی ہے، اور امت اسلامیہ میں اس کے مظاہر تاریخ کا حصہ ہیں۔عقل عیار اور طبائع کی آزادی نے شریعت کی حدود و قیود سے نکلنے کے لئے ہمیشہ زور لگایا اور اس کے لئے سو طرح کے انداز اپنائے ،کہیں علی الاعلان اور کھلم کھلا اور کہیں مخفی اور دھیمے اور کہیں نام نہاد علمی اسلوب ،فتنہ انکار ،حدیث ، پاک و ہند میں قدیم زمانے سے پھیل رہا ہے۔ مگر ربانی علماء نے بحمدا للہ کبھی بھی ان لوگوں کو حق سمجھانے اور انہیں راہ حق دکھانے میں سستی اور کمزوری نہیں دکھائی ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ بھی فر ما چکے ہیں :

‘‘یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ،ینفون عنہ تحریف الغالین ،وانتحال المبطلین ،وتاویل الجاھلین’’ (حدیث مرسل ہے۔بیہقی)

یعنی ہر نسل میں سے اس کے عادل لوگ اس علم (دین و شریعت اور قرآن و حدیث)کو حاصل کرتے رہیں گے ،جو اسے غالیوں ،کی تحریفات ،باطل پرستوں کے دعاوی اور جہلاء کی تاویلات سے صاف کرتے رہیں گے۔

جناب امین احسن اصلاحی صاحب اور ان کے تلمیذ رشید غامدی صاحب نے انکار حدیث کا اپنے انداز سے علمی اور عقلی اسلوب اپنایا ہے۔ جو ''روشن خیال''مسلمانوں میں پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔ ان کے مزعومہ حقائق کی کئی ایک اہل علم نے حقیقت واضح کی ہے۔

اسی سلسلے میں ہمارے محترم جناب عبدالوکیل ناصر صاحب کی ایک کوشش آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں انہوں نے ''حدیث و سنت'' میں فرق کے دعویٰ کی حقیقت کو علمی اصول و مصادر سے واضح کیا ہے۔ اگر یہ قرآن حکیم محض فطرت اور لغت سے ہی سمجھنے کی چیز ہوتی تو کون تھاجو ''ٹ ٻ ٻ پٻپپٻپ''[1] کی روشنی میں اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اورامن والا کہہ سکتا تھا، یا رمضان کے روزوں میں ''ڃ ڃ ڃ ڃ چ ڃ چ چ'' (البقرة ۱۸۷)[2] کی بنا پر اپنے اپنے تکیے کے نیچے سیاہ و سفید دھاگے نہ رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ وغیرہ۔۔۔

یہ تو رحمت للعالمین علیہ الصلاۃ والسلام ہی مبیّن حق تھے جنہوں نے

---

[1] ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے پھر ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، انہی کے لئے امن و سلامتی ہے اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں(الانعام آیت ۸۲)(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں یہی معلوم ہوا کہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ جو کسی صورت معاف نہیں ہوگا۔

[2] ترجمہ:۔۔۔اور فجر کے وقت جب تک (لفظی ترجمہ) سفید دھاگے کالے دھاگے سے نمایاں نہ ہوجائے تم کھا پی سکتے ہو۔(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے معلوم ہوا کہ یہاں فجر صادق کی سفید دھاری مراد ہے۔)

مذکورہ بالا اور اس طرح کے زندگی کے بے
شمار مسائل کو بنی نوع انسانی کی خاطر
رہتی دنیا تک کے لئے قابل عمل اور آسان
بنا دیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہم قرآن مجید کے ساتھ ساتھ احادیث
نبویہ کیوں پڑھتے پڑھاتے ہیں؟ اس لئے کہ
قرآن اور صاحب قرآن آپس میں لازم و
ملزوم ہیں۔مثلاً :

‘‘ٿ ٹ ٺ ٹ ٹ ڤ ڦ ڦ ڦ ڦ ڦ’’
(النحل: ۴۴)

ترجمہ:‘‘اور ہم نے آپ پر یہ ذکر(یعنی
کتاب)نازل کی ہے، تاکہ جو (ارشادات)
لوگوں کی طرف نازل کیے گئے ہیں آپ
انہیں خوب واضح کریں اور وہ غورو فکر
بھی کریں’’۔

‘‘ڇ ڇ ڇ ڍ ڍ ڌ ڌ ڎ ڎ ڎ ڎ’’(1)

ترجمہ:‘‘کہہ دیجئے کہ اللہ اور اس کے
رسول کا حکم مانو، اگر نہ مانیں تو اللہ
بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا’’۔

‘‘ڈ ڈ ...’’(2)

ترجمہ:‘‘اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو
رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو
ضائع نہ ہونے دو’’۔

حجیت حدیث کی کتب میں قرآن کریم
کی بیسیوں آیات سے رسول اللہ ﷺ کے قول
و فعل کے اخذ اتباع کا ثبوت ملتا ہے۔

برادر عزیز کی یہ تحریر جہاں علمی
اور اصولی ہے،اس میں کہیں کہیں تلخی
بھی محسوس ہوتی ہے اور اس کی وجہ

---

(1) سورہ آل عمران آیت ۳۲

(2) سورۂ محمد آیت ۳۳

وہ (ان شاء اللہ) غیرت ایمانی ہے اور رسول مقبول ﷺکی کرامت سے دفاع کا جوش ہے جو قلم سے بہہ نکلا ہے ۔ اہل نظر سے امید ہے درگزر فرمائیں گے۔

ہم اپنے برادران سے جو یقیناً اللہ، اس کے رسول اور اس کے دین سے محبت رکھتے ہیں اور ان کا شوق ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی شریعت کے مطابق زندگی گزاریں اور آخرت میں بھی سرفراز ہوں، اور وہ طلب گار اور پیاسے ہیں ان سر چشموں کے جہاں سے انہیں یہ آب حیات مل سکے۔ تو ہم انہیں قابل اعتماد ،راسخ فی العلم اور ربانی علماء کی مجلس اور صحبت اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں ،جو بحمداللہ جگہ جگہ اپنی جوت جگائے بیٹھے ہیں، وکثراللہ سوادھم ، اور امت مسلمہ کی ڈیڑھ ہزار سالہ امانت کے امین، محافظ اور پیامبر ہیں، اور اس موضوع کی معتبر کتب بھی مکتبات میں میسر ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کو کما حقہ سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عنایت فرمائے، اور اس پر ثابت قدم رکھے اور ہر قسم کی جہالت، زلت، ضلالت اور ظلم سے محفوظ رکھے۔

وصلی اللہ علی النبی محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین

کتبہ عمر فاروق السعیدی

(سابق مدیر التعلیم :جامعہ ابی بکر الاسلامیہ کراچی)

حال نزیل :جامعہ مرأۃ القرآن والحدیث ،منڈی واربرٹن

مقدمہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم
وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ
(الاسراء آیت ۹)

''یقیناً یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو بہت ہی سیدھا ہے۔''

قرآن سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لئے دو شرطیں انتہائی اہم و ضروری ہیں۔ ۱) قلب سلیم ۲) عقل صحیح

اگر کوئی شخص ان دو شرطوں کا لحاظ و پاس کرتے ہوئے قرآن مجید کا مطالعہ کرے تو وہ نبی علیہ السلام کا طریقہ کار اختیار کرنے والا اور تمام عقائد و اعمال میں آپ کی اتباع کرنے والا بن جاتا ہے۔

نبی ﷺ نے قرآنی احکامات کی تعمیل میں جو بھی طریقہ کار اختیار کیا اسے اسوہ حسنہ کہا جاتا ہے اور مومنین کے

لئے اس ‘‘اسوہ حسنہ’’ کی اتباع تا قیامت
واجب ہے۔ کیوں کہ اسے اختیار کئے بغیر
قرآن مجید پر عمل نا ممکن ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ قرآن مجید میں توحید کی حقیقت
کو اجاگر کرنے اور اس سے تمسّک اختیار
کرنے پر سب سے زیادہ دلائل دینے کے بعد
اگر کوئی مسئلہ انتہائی شدو مد کے ساتھ
بیان کیا گیا ہے تو وہ اطاعت و اتباع رسول
ﷺ ہی ہے اور یہی محبت الٰہی کے حصول
کی سبیل ہے۔

قلب سلیم پابند ہے کہ مبہم اور متشابہ
آیات کے پیچھے نہ لگے کہ اس کی کرید
میں لگنا ہی کج روی اور کج فہمی کی
دلیل ہے۔ اور خود قلب سلیم کو قلب
سقیم میں بدل ڈالنے کی کوشش ہے۔

﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا
تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَاْوِيْلِه وَ مَا
يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ
يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِه كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا يَذَّكَّرُ
اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ (آل عمران آیت ۷)

‘‘پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس
کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ، فتنے
کی طلب اور انکی مراد کی جستجو کے لئے
حالانکہ ان کی حقیقی مراد کو سوائے اللہ
تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا اور پختہ و مضبوط
علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو ان پر
ایمان لاچکےہیں یہ ہمارے رب کی طرف سے
ہیں اور نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے
ہیں۔’’

عقل سلیم یقیناً اللہ کی عظیم نعمت

ہے جس کا صحیح استعمال انسان کو
معرفت الٰہی کے اعلیٰ و ارفع درجات پر لے
جانے کا باعث ہے ۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے
قرآن مجید میں جا بجا غورو فکر اور عقل
و تدبر سے کام لینے کا حکم دیا ہے ۔حتی
کہ بے عقلوں کو فرمایا‘‘ویجعل الرجس علی
الذین لا یعقلون’’ کہ بے عقلوں پر وہ
نجاست ڈال دیتا ہے۔

مگر جب نقل و عقل (یعنی شرع اور
انسانی عقل) میں (بظاہر) ٹکراؤ محسوس
ہو تو پھر نقل کو مقدم کرنا ہے ۔شرعاً
واجب ہے کہ اہل ایمان کا شیوہ ہے‘‘آمنا
بہ کل من عندربنا’’۔

شریعت مطہرہ خلاف عقل حقیقتیں بیان
نہیں کرتی مگر بسا اوقات احکام شرع عقل کو
حیران ضرور کر دیتے ہیں۔

گمراہی اور انکار سنت کے بنیادی محرکات
میں خود ساختہ عقلی اصول و قواعد کے بعد دو
ہی چیزیں دکھائی دیتی ہیں ۔(۱) فلسفیانہ
نظریات سے مرعوبیت۔(۲) اتباع ہوائے نفس۔
تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک کلمہ گو
شخص جب دیکھتا ہے کہ اسلام میں اس کے
عقائد ،اعمال ، افعال ،معاملات ،اکتساب ورزق
وغیرہ پر کچھ پابندیاں عائد ہیں جب کہ مادر
پدر آزاد غیر مسلم یورپین ممالک میں ہر قسم
کی آزادی میسر ہے تو وہ ان سے مرعوب ہو کر
متاثر کن انداز میں اپنی خواہشات نفسانیہ
کو‘‘حاکم کل’’ سمجھ بیٹھتا ہے اور اس کے نتیجہ
میں وہ باوجود علم رکھنے کے قعر مذلت میں جا
گرتا ہے اور پھر نہ صرف یہ کہ جواہر علمیہ

سے تہی دست ہو جاتا ہے بلکہ تو اپنی انسانیت بھی کھو بیٹھتا ہے۔

﴿ اَ فَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰــهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ ﴾ (الجاثیہ آیت **۲۳**)

‘‘کیا آپ نے اسے بھی دیکھا، جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور باوجود علم کے اللہ نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔’’

﴿اَ رَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰــهَهٗ هَوٰىهُ اَ فَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾ (الفرقان آیت۴۳،۴۴)

‘‘کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو معبود بنائے ہوئے ہے کیا آپ اس کے ذمے دار ہو سکتے ہیں ؟ کیا آپ اسی خیال میں ہیں کہ ان میں کے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں ؟وہ تو نرے چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔’’

دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل سے لے کر آج تک جتنے بھی فتنے پیدا ہوئے ان کی گمراہی کے اہم محرکات میں (ذکر کردہ)عوامل کا بنیادی کردار رہا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ رسول معصوم ﷺ کے اقوال و افعال کی تنقیص و تردید کے لئے اس کلام مقدس کو بطور ڈھال کے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جو نبی رحمت ﷺ کے دل اطہر، پر نازل ہوا اور اس کے مبین و شارح باذن اللہ بلا شرکت غیرے آپ ﷺ فرد واحد ہی تھے۔

اللہ تعالیٰ بھی اپنا قانون چلا رہا ہے کہ ‘‘یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً’’ خود متاثرین اغیار بھی اس ستم ظریفی پر خاموش نہ رہ سکے اور یوں گویا ہوئے!

انتہائی بد قسمتی یہ ہے کہ آج جتنے فتنے اٹھ رہے ہیں وہ زیادہ تر قرآن ہی کے نام سے اٹھ رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن فتنوں کو مٹانے کے لئے آیا تھا، فتنوں کو ابھارنے اور ان کو غذا دینے کے لئے نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ماضی میں بھی اور آج بھی جتنے فتنے اٹھے یا اٹھ رہے ہیں وہ سب قرآن ہی کی آڑ لے کر نمودار ہوئے۔ خوارج اپنے گمان کے مطابق قرآن مجید ہی کے سہارے ابھرے، باطنیوں کے تمام استدلالات کی بنیاد ان کے خیال میں قرآن مجید ہی پر ہے۔ بابیوں اور بہائیوں نے جو کچھ کیا اپنے زعم کے مطابق قرآن مجید ہی سے کیا۔ قادیانیوں کی (جھوٹی) نبوت کی اساس ان کے دعویٰ کے مطابق قرآن مجید ہی پر ہے۔

اور چکڑالوی تو قرآن کے سوا کچھ بولتے ہی نہیں ،اور یہ تو ہزاروں فرقوں اور گروہوں میں سے صرف چند کے نام لئے گئے ہیں۔ تاریخ اسلام کے تمام فرقوں کے حالات اور ان کے اساسی معتقدات اگر معلوم کیجئے تو قرآن مجید آپ کو ہر ایک کے ہاتھ میں نظر آئے گا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کے کچھ خاص آداب و

قواعد ہیں، جن کا لحاظ و اہتمام ضروری ہے۔ ان کے بغیر قرآن کی راہ نہیں کھل سکتی۔ ان میں سب سے مقدم یہ ہے کہ انسان بالکل خالی الذہن ہوکر اس کو صرف طلب ہدایت کے لئے پڑھے اور اپنے قلب و دماغ کو پورے طور پر اس کے حوالے کر دے۔ اپنے دل کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دے۔ تمام خیالات و معتقدات سے خالی ہو کر اپنے تئیں اس امر کے لئے آمادہ کرے کہ قرآن کے اندر اپنی خواہشات کے لئے سند جواز، اپنے معتقدات کے لئے حیلے اور اپنے نفس کے لئے جائے پناہ تلاش نہیں کرے گا۔ کج بحثیاں اور اعتراضات نہیں ڈھونڈے گا۔ بلکہ تشفی اور طمانیت تلاش کرے گا ، اس کی روشنی جس طرف راہنمائی کرے گی اسی طرف قدم بڑھائے گا۔ یہ کوشش نہیں کرے گا کہ قرآن مجید کو اپنی خواہشات نفس کے پیچھے لگائے جس شخص کا مقصود طلب ہدایت نہ ہو بلکہ اعتراض اور کج بحثی ہو اور اس کی خواہشوں نے اس کے دل میں جو وسوسے پیدا کر دیئے ہوں قرآن مجید کو ان سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو اس کے لئے قرآن مجید میں بالکل محرومی ہی محرومی ہے۔ (مبادی تدبر قرآن از مولانا امین احسن اصلاحی)

مولانا امین احسن ان ساری نصیحتوں کی پاسداری فرماتے، اپنے شاگردوں اور حواریوں کو اس نصیحت کا پابند بناتے مگر افسوس صد افسوس یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا ہے اور نہ ہی

شاید کبھی ہو سکے گا۔ کیوں کہ حواریین بھی اپنے پر پرزے نکالنے لگے ہیں۔ واللہ المستعان

قرآن مجید کی آڑ میں کبھی بھی فتنہ ضلالت و گمراہی کو پھلنے پھولنے نہیں دیا گیا خیر القرون میں بھی جب کسی نے کہا کہ ‘‘لا تحدثنا الا بالقرآن’’ تو اسے ‘‘انک امرؤ احمق’’ کے خطاب سے نوازا گیا۔ نیز اس کے اشکالات کے سامنے سنن و احادیث کا بند باندھ دیا گیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسی فتنہ کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص قرآنی آیات سے تمہارے دل و دماغ میں شبہ ڈالنا چاہے تو سنتوں سے اس کا سدّ باب کرنا۔ (جامع بیان العلم)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ :تمہیں کچھ لوگ قرآن کی طرف بلائیں گے جب کہ وہ خود قرآن سے بیزار ہوں گے۔ (جامع بیان العلم)

الحمدللہ ثم الحمدللہ ‘‘لا تزال طائفة من امتی۔۔۔ ’’ کا مصداق طائفہ منصورہ،اھل حدیث و سنت ہر ہر دور میں اہل بدعت و ضلالت کے شبہات و تحریفات کا بھر پور تعاقب کر تے رہے ہیں اور یہ انہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ فتنہ انگیزوں کی سرکوبی کرتے ہوئے ان کی تاویلات فاسدہ کو عوام الناس کے سامنے بے نقاب کرتے رہیں۔ فجزاھم اللہ خیرالجزاء

افکار اغیار سے متاثرین اور نام نہاد نعرۂ قرآنی ‘‘حسبنا کتاب اللہ’’ بلند کرنے والے حدیث

بہ زار طبقوں میں بھی مختلف درجات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے خطرناک گروہ وہ ہے جو اصلاً اصطلاحات کو ہی بدل ڈالنا چاہتا ہے اور اس کے لئے وہ مسلّمہ عقائد و نظریات کے انکار سے بھی حیا نہیں کرتا۔

ایسے ہی متجد دین و نام نہاد قرآنی مصلحین میں مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے شاگرد جاوید احمد غامدی سر فہرست ہیں اور اب ان کی جدید فکر باقاعدہ ایک گروہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جو ہر صورت میں احبا ب و اغیار کے درمیان عقائد و اعمال اور تہذیب و تمدن کی حائل خلیج کو پاٹنا چاہتے ہیں۔

مولانا امین احسن کی ‘‘مبادی تدبد حدیث’’ تدبر سے زیادہ تمسخر کی راہ دکھاتی ہے کہ کبھی قرآن کو سنت کی جھولی میں ڈال دیا اور کبھی سنت کے اثبات کے لئے قرآنی اساس نہ ملنے کی وجہ سے سنت کو گویا طلاق سے نواز دیا۔ کبھی بلا دلیل ہی احادیث کو ضعیف، موضوع اور کبھی برہمنیت کی بدبو سے اٹا ہوا کہہ دیا۔

تضاد بیانی اس قدر کہ گویا مصنف خیال پراگندہ کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

شاگرد موصوف جناب جاوید غامدی صاحب کی‘‘اصول و مبادی’’ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے‘‘مبادی تدبر حدیث’’ کا ملغوبہ و چربہ ہے جسے نئے لبادے میں پیش کر دیا گیا ہو۔ مسمیٰ ایسا کہ اسم اسکا مخالف دکھائی دیتا ہے۔ کوئی بھی اصول

کسی اصل و نقل پر قائم دکھائی نہیں دیتا۔

غامدی صاحب پیغمبر ﷺ کے اختیارات سلب کرنے کی جسارت کے مرتکب دکھائی دیتے ہیں، مگر اپنے اختیارات انتہائی وسیع رکھتے ہیں، تاکہ جب چاہیں جو چاہیں کر گزریں۔

اپنے زعم میں کبھی سنت کو قرآن سے مقدم کہتے ہیں ،تو کبھی سنت بھی اپنے اثبات میں قرآنی اساس کی طالب؟ اپنے زعم میں عربی ذوق اس قدر رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ائمہ لغت ،ائمہ محدثین، جناب کے سامنے ہیچ ہیں کہ جو ذوق عربی، عجمی غامدی کو مطلوب ہے یہاں مفقود ہے۔

بہر حال اس طویل لاطائل اور لا ینحل مباحث و نظریات پر تحقیقی نظر سے جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ زیر نظر ہے۔

اس تحریر میں جناب امین احسن اصلاحی کی ‘‘مبادی تدبر حدیث’’ اور جناب جاوید احمد غامدی کی‘‘اصول و مبادی’’ کے منتخب ابواب کو ہی سامنے رکھا گیا ہے ،اور اس پر نقد و نظر میں اقوال سلف صالحین کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

صاحبین کے خود ساختہ اصول و قواعد کی تضاد بیانیاں اور اصطلاحات محدثین سے ان کا متصادم و معارض ہونا واضح کیا گیا ہے۔ والحمدللہ علی ذلک۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے استاذ محترم شیخ عمر فاروق السعیدی صاحب

حفظہ اللہ کو کہ انہوں نے انتہائی دقیق نظر سے مسودے کو دیکھا اور اس کی نوک پلک سنوار کر اپنی قیمتی آراء سے بصورت تقریظ آگاہ کیا۔ جزاہ اللہ خیرالجزاء

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تحریر کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور میزان حسنات کا ذخیرہ بنائے ۔آمین

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین

کتبہ **عبدالوکیل ناصر** عفی عنہ

مولانا امین احسن کا دعویٰ !

اس مضمون میں وہ اصول و مبادی میں نے بیان کر دئیے ہیں جو احادیث کو سمجھنے اور ان کی صحت و سقم کا فیصلہ کرنے کے لئے میں ضروری سمجھتا ہوں اور جن کو میں نے ملحوظ رکھا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے۔ جس میں کوئی مجھے منفرد قرار دے سکے۔ یہ ساری باتیں ہمارے ائمہ حدیث کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں اور یہ ایسی معقول اور فطری ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرسکتا۔

جو لوگ صرف اپنے فقہی مسلک ہی کی حدیثیں پڑھنے پڑھانے پر قانع ہیں ان کا کام بہت سہل ہوتا ہے ممکن ہے وہ ان اصولوں کی قدرو قیمت کا اندازہ نہ کر

سکیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ ان سے متوحش ہوں گے۔ اور انہیں اصولوں کی روشنی میں امہات حدیث کا مطالعہ کیا ہے اور ان کا درس دیا ہے۔

(دیباچہ مبادی تدبر حدیث)

مولانا کے دعویٰ کا تجزیہ

مولانا امین احسن مرحوم کی شخصیت ہم عصر علمائے حدیث میں سخت متنازعہ رہی ہے۔ ایسی صورت میں موصوف کا مذکورہ دعویٰ غلط فہم یا خوش فہمی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

زیر نظر و زیر تبصرہ کتاب ‘‘ مبادی تدبر حدیث’’ کے بارے میں اہل علم میں معروف شخصیت حافظ صلاح الد ین یوسف رقم طراز ہیں کہ:

‘‘اس کتاب میں انہوں نے حدیث کو پرکھنے کے محدثانہ اصول کو ناکا فی قرار دیتے ہوئے خود نئے اصول وضع کئے ہیں جس کی وجہ سے محدثین کی ساری کاوشیں تو بے کار قرار پاتی ہیں ،اور ان کے مجموعہ ہائے احادیث صحیحہ بے وقعت ۔ مولانا اصلاحی کے گھڑے ہوئے اصولوں کی رو سے صحیح حدیث وہ نہیں ہے جو صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے یا جو محدثین کے مسلمہ نقد و جرح کی روشنی میں صحیح ہے بلکہ وہ حدیث صحیح ہوگی جو اصلاحی من گھڑت اصول کی روشنی میں صحیح ہوگی۔ چاہے محدثین کے مسلمہ اصول کی رو سے وہ ضعیف ہو ،اور وہ حدیث ضعیف

ہو گی جسے اصلاحی صاحب کے گھڑے ہوئے
اصول کی تائید حاصل نہ ہوگی۔ چاہے
محدثین کے ہاں اس کی صحت مسلم ہو
۔’’ (ماہنامہ محدث اگست2001جلد 33شمارہ 8)

مولانا امین احسن کے بارے میں آج سے کافی عرصے قبل مولانا حافظ اسماعیل سلفیؒ نے فرمایا تھا کہ: ان کے نظریات نہ صرف مسلک اہلحدیث کے خلاف ہیں بلکہ ان کے نظریات تمام ائمہ حدیث کے بھی خلاف ہیں، ان میں آج کے جدید اعتزال و تجّم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (حوالہ مذکور)

مولانا کا یہ دعویٰ کرنا کہ ‘‘یہ ساری باتیں ہمارے ائمہ حدیث کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں سراسر لغو اور باطل ہے۔(جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) کہ کوئی بھی امام حدیث اس چودہ سو سال کے عرصے میں ایسا نہیں ہے جو مولانا امین کے نظریات اور مبادی تدبر حدیث رکھتا ہو ۔مولانا صرف ائمہ سلف صالحین کا نام اور ان کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور ستم یہ کہ ان اصطلاحات کا بھی خود ساختہ معنی کشید کر کے ان ائمہ کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

مولانا کا فرمانا کہ ان کے بیان کردہ اصول ایسے‘‘معقول اور فطری ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا’’ اور پھر فقہی مسالک کی احادیث پڑھنے والوں کو یہ لکھنا کہ وہ‘‘ ان(قواعد اصلاحی’’ سے متوحش ہوں گے’’ تو کیا مولانا یہ کہنا

چاہتے ہیں کہ جو علما، فقہا، ‘‘ان کے خود ساختہ’’ مبادی تدبر حدیث کو نہیں مانتے وہ بے عقل و بے وقوف ہیں یا یہ کہنا چاہتے ہیں(معتزلہ کی طرح) کہ عقل انسانی بھی ہر چیز اور اصول و قواعد کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔

اگر پہلی بات مراد ہے تو پھر صرف اصلاحی صاحب اور ان کے ہم فکر رفقاء ہی عقل مند ہوئے جب کہ چودہ سو سال سے اصول محدثین و فقہا کے پابند(نعوذ باللہ)بے وقوف قرار پائے اور اگر دوسری بات مراد ہے تو پھر بھی عقل اصلاحی سب عاقلوں پر فوقیت رکھتی ہے کہ اس نے عقل انسانی کو ردو قبول کی کسوٹی قرار دیا۔گویا مولانا ہر طرف اور جہت سے شیخ الکل قرار پائے ۔اچھا ذرا یہ بھی جائزہ لے لیں کہ مولانا نے مذکورہ دونوں باتوں سے جو کچھ مراد لیا ہے اس میں کتنے ائمہ و محدثین ان کے ساتھ ہیں؟(کوئی بھی نہیں)

اب یہ بات تو بالکل واضح ہی ہے کہ مولانا جب خود ساختہ‘‘ مبادی تدبر حدیث’’ کے اصول کو سامنے رکھ کر ‘‘ امہات حدیث ’’ کا مطالعہ کریں گے تو کیا کیا راز افشا کریں گے۔ کبھی سنت و حدیث میں فرق اور کبھی دونوں ایک، کبھی اصول و اصطلاحات محدثین سے ہٹ جانا، اور کبھی ان سے ہٹنا اور انہیں بدلنا منکرین حدیث کی جسارت، کبھی رجم کا انکار کہ غیر قرآنی ہے اور کبھی اقرار کہ یہ قرآن سے ثابت ہے وغیرہ وغیرہ ۔تفصیل آگے آ رہی

ہے۔
اصول اصلاحی:

حدیث اور سنت میں فرق

مولانا اصلاحی کہتے ہیں حدیث اور سنت میں آسمان و زمین کا فرق ہے اور دین میں دونوں کا مرتبہ و مقام الگ الگ ہے۔

حدیث:حدیث نبیﷺ کے کسی قول یا فعل یا آپ کی کسی تصویب کی روایت کو کہتے ہیں۔ (صفحہ۱۹)

خبر تواتر۔۔۔۔۔۔یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خبر تواتر کا اسم تو موجود ہے لیکن ہمارے علم کی حد تک ا س کا کوئی صحیح مسمّی موجود نہیں ہے۔ (صفحہ۲۰)

ہمارے نزدیک وہ احادیث جنہیں خبر متواتر کہا گیا ہے تحقیق طلب ہیں ۔۔۔۔۔ البتہ ۔۔۔۔ سنت کو تواتر کا درجہ حاصل ہے۔ (صفحہ۲۱)

حدیث و سنت کے فرق کا تجزیہ

جناب امین اصلاحی صاحب اپنے اس دعوی پر قائم نہیں رہ سکے کہ ان کی یہ کتاب ''ائمہ حدیث'' کی مستند کتب سے ماخوذ ہے کیوں نہ انہوں نے حدیث اور سنت کے اس ''زمین و آسمان'' کے فرق پر کسی بھی امام کا کوئی قول نقل نہیں کیا۔ اصطلاحات المحدثین کو بدل ڈالنے کو مولانا خود بھی منکرین حدیث کی جسارت

قرار دیتے ہیں(دیکھیے مقدمہ تدبر قرآن)لیکن تدبر حدیث پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مولانا کے یہ فتوے کی زد خود آپ پر پڑتی ہے۔

باقی رہا یہ دعوی کہ ''دونوں کا دین میں مقام و مرتبہ الگ الگ ہے۔ تو اس کی بھی کوئی دلیل انہوں نے ''ائمہ حدیث کی مستند کتب'' سے نہیں دی اور نہ خود ہی کوئی ''مقام و مرتبہ'' الگ الگ بیان کیا آخر کیوں؟

جب یہ تسلیم کر لیا کہ حدیث اس روایت کا نام ہے جس میں قول و فعل رسولﷺ کا بیان ہوا ہو تو پھر اسے سنت سے جدا کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ تو سنت ہی بیان کرتی ہے اور بس۔۔۔۔؟

ائمہ سلف صالحین نے حدیث و سنت میں ''اصطلاحاً'' اس طرح کا فرق کبھی نہیں کیا بلکہ دونوں کو مترادف اور ہم معنی کہا ہے۔ مثلاً امام ابن اثیرؒ سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اذا اطلقت فی الشرع فانما یراد بہا ما أمر بہ النبی ونہی عنہ وندب الیہ قولاً وفعلاً ۔۔۔۔ولہذا یقال فی ادلۃ الشرع الکتاب و السنۃ ای القرآن والحدیث''
(النہایۃ فی غریب الحدیث)

ترجمہ:''شرع میں سنت سے مراد علی الاطلاق نبی مکرم کا حکم دینا ،،منع کرنا اور آپ کا اپنے قول و فعل سے کسی کام کی ترغیب دلانا ۔۔۔۔۔اسی لئے ادلہ شرعیہ میں کتاب و سنت کو رکھا جاتا ہے ،یعنی قرآن وحدیث''

ڈاکٹر صبحی صالح رقم طراز ہیں کہ اگر ہم محدثین بالعموم اورمتأخرین بالخصوص کی غالب رائے پر عمل کریں تو ہم حدیث و سنت کے الفاظ کو مترادف و مساوی پائیں گے ۔ (علوم الحدیث نیز علوم الحدیث از عبدالرؤف ظفر)

امام ابن عبدالبر ،امام شاطبی اور امام ابن تیمیہ و ابن قیم ؒ کی تحریروں میں بھی سنت و حدیث میں اس طرح کا کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا ۔شیخ مصطفی سباعی نے ‘‘السنة ومکانتھا ’’ لکھ کر حدیث ہی کا دفاع کیا ہے جو بیّن دلیل ہے کہ سنت و حدیث میں کوئی فرق نہیں ہے۔

خبر تواتر کا فقط اسم مان کر مسمّٰی کا انکار در حقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ موصوف کے ہاں جس طرح خبر واحد قابل حجت نہیں اگرچہ کثیر تعداد میں ہو اسی طرح خبر متواتر بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ ان کے ہاں خبر متواتر (ان کے اصولوں پر) ثابت ہی نہیں ہوتی۔ گویا کام ہو گیا نہ رہا بانس نہ بجے گی بانسری، گلو خلاصی ہوگئی۔ اب یہ دعوی کیسا ہوگا کہ ‘‘قرآنی احکام کی تفصیل کے لئے سنت اور حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔’’ (صفحہ ۳۳)

‘‘جناب شیخ کا قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی ,,

حدیث کے ردو قبول کا پیمانہ کیا ہوا؟ جسے چاہا حدیث متواتر کہہ کر اس سے

سنت ثابت کردی اور جسے چاہا خبر آحاد کہہ کر رد کر دیا اور ''ائمہ حدیث'' کی مستند کتابوں سے کوئی حوالہ بھی اپنی تائید میں نہ دیا۔ اگر ''محدثین'' کے پیمانے سے گزر کر تواتر کا درجہ پانے والی احادیث تحقیق طلب ہیں تو پھر کل کو قرآن کی قراءات متواترہ بھی تحقیق طلب ہو جائے گی۔ اور ''ائمہ محدثین'' کی مستند کتابوں سے دلیل کے بجائے اصول اصلاحی پیش کئے جائیں گے پھر کیا ہوگا؟ اصلاحی اور ان کے رفقاء کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ اصول ائمہ حدیث کو چھیدتے رہیں اور اپنے مسموم نظریات کو ''ائمہ حدیث'' پر چسپاں کر کے انہیں اپنا ہمنوا ثابت کرتے رہیں۔ اگر بلا دلیل ہی یہ اختیار انہیں حاصل ہے تو پھر یہ اختیار کسی کو بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور پھر جو نتیجہ نکلے گا وہ ایسا ہوگا جیسے غلام احمد پرویز نے اپنی خود ساختہ اصطلاحات سے نظام ربوبیت، قانون خداوندی اور نہ جانے خود اللہ اور رسول کے کیا کیا معنی بیان کر دیئے اگر وہ اصطلاحات ائمہ و محدثین بدل کر منکرین حدیث قرار پاتے ہیں تو جناب اصلاحی کے اپنے الفاظ خود ان پر بھی صادق آتے ہیں کہ اصطلاحات کا بدلنا منکرین حدیث کی جسارت ہے۔

اگر خبر تواتر کا مسمیٰ [1] موجود نہیں

---

(1) احادیث متواترہ میں سے چند ایک یہ ہیں فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، رکوع میں جاتے ہوئے اور اٹھتے ہوئے رفع الیدین کرنا، جو اپنی شرمگاہ کو چھولے وہ وضو کرے، درمیانی نماز عصر ہے، جمعہ کے روز غسل کرنا وغیرہ وغیرہ۔ (تفصیل امہات الکتب میں دیکھئے)۔

تھا تو کیا ائمہ حدیث نعوذباللہ پاگل تھے کہ انہوں نے پھر بھی متواتر کی اصطلاح بنا ڈالی؟

‘‘سنت کو تواتر حاصل ہے’’ یہ جناب کا دعوی ہے مگر یہ تواتر ثابت کس طرح ہوگا؟ لوگوں کے عمل سے یا کسی مخصوص شخصیت کے عمل سے؟ جب کہ موصوف کے ہاں بھی سنت رسولﷺ کے قول و فعل تقریر و تصویب پر مشتمل ہے اور یقیناً سنت کا اصل مرجع و ماخذ واحد شخصیت ہے اور وہ رسول مقبولﷺکی ذات والا صفات ہے تو پھر سنت میں یہ قید لگانا کہ یہ تواتر عملی سے ملی ہے ۔ احادیث سے نہیں کس قدر تجاہل عارفانہ کی مثال ہے کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ یہ قید صحابہ کے لئے بھی تھی ؟ اگر تھی تو دلیل کیا ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر ان کے اور ہمارے معیار رد و قبول میں فرق کیوں؟ اگر روایات و احادیث سے سنت ثابت نہیں ہوتی تو موصوف بار بار معصومانہ انداز میں احادیث کے حوالے کیوں دیتے ہیں؟ (تفصیل آگے آرہی ہے)

موصوف نے زیر بحث مسئلہ میں یا اس سے قبل کے مسئلہ میں کسی بھی امام حدیث کی مستند کتاب سے کوئی حوالہ نقل نہیں کیا۔ تو ثابت ہوا کہ موصوف استاذ العلماء والمحدثین(الاحیاء والاموات) بنے ہوئے ہیں اور سب سے منفرد ہیں۔

اصلاحی صاحب کے ہاں
تعریف سنت

سنت کے لغوی معنی ہیں واضح راستہ، مصروف راستہ، پٹا ہوا راستہ۔ آگے لکھتے ہیں: ہمارے زیر بحث اس وقت سنت نبی ﷺ یعنی وہ طریقہ جو آپ نے بحیثیت کامل نمونہ کے احکام و مناسک کے ادا کرنے اور زندگی کو اللہ تعالی کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے عملاً اور قولاً لوگوں کو بتایا اور سکھایا۔ (صفحہ ۲۴)

منکرین سنت کا یہ کہنا کہ نبی ﷺ کی حیثیت ایک خط پہنچادینے والے قاصد کی ہے بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔

دین کا پورا اور مکمل ڈھانچہ سنت رسول سے کھڑا ہوتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور دوسرے احکام ومناسک کا بنیادی حکم تو قرآن مجید میں دیا گیا ہے لیکن ان میں سے کسی چیز کی جزئیات و تفصیلات نہیں بتائی گئیں۔۔۔۔

۔۔۔اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سنت ہی سے واضح ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی ﷺ نے فرمایا:‘‘الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ’’(ابو داؤد، کتاب السنہ)آگاہ رہو میں قرآن دیا گیا ہوں اور اسی کی مانند اس کے ساتھ اور بھی۔ پس جس طریقے سے قرآن واجب ہے اسی طریقے سے سنت بھی واجب ہے۔۔۔۔ (صفحہ ۲۶،۲۷)

ایک ہی معاملے میں سنت مختلف ہو سکتی ہے۔ (صفحہ ۳۰)

ہمارے نزدیک یہی صورت آمین بالجہر

اور آمین بالسر کی اور ہاتھ باندھ کر یا ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے کی بھی ان میں سے ہر ایک سنت ہونے کے امکانات و قرائن بلکہ دلائل موجود ہیں۔“
(صفحہ ۳۱)

اصلاحی تعریف سنت کا تجزیہ:

موصوف اصلاحی صاحب نے (اللہ کا شکر ہے کہ) سنت کے لغوی معنی نہیں بدلے ۔مگر اصطلاح میں خود ساختہ معنی لینا جناب کی مجبوری ہے اور اسے قول و فعل میں محصور کرنا بھی ان کی بڑی اہم مجبوری ہے جس کو(ہم) اپنی کم علمی کے باعث شاید سمجھ نہیں پاتے۔

مگر قول و فعل اور اسوہ حسنہ کی قید سے عقیدہ ،ایمانیات ،وغیرہ کو خارج کر دینا کسی‘‘ائمہ حدیث کی مستند کتب ’’ سے ثابت ہے ؟ تو پھر جناب اس مسئلہ میں منفرد ہوئے نا۔ایک طرف تو قول و فعل میں سنت کو محصور کر دیا اور دوسری طرف لکھ دیا کہ سنت سے مکمل دین کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے اور مزید لکھا ہے قرآن سنت سے ہی واضح ہوا عجیب تضاد ہے یا تجاہل عارفانہ یا پھر جناب‘‘دروغ گوار حافظہ نہ باشد’’ کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ کیا مکمل ڈھانچہ بلا عقیدہ و ایمان کے ہوگا؟ کیا قرآن جو سنت سے واضح ہو اس میں عقیدہ و

ایمانیات نہیں ہیں؟ اگر ہیں توا صلاحی قید کہ سنت قول و فعل میں محصور ہے سراسر باطل ہے جس کی تردید جناب کے قلم نے خود ہی کر دی ہے۔ فافهم

اور یہ تو ہر صاحب علم جانتا ہے کہ دین اسلام نام ہی عقیدہ توحید کا ہے جس کی وضاحت ''الانبیاء اخوۃ العلات ودینهم واحد'' میں موجود ہے۔ نہ جانے کیسا ''مکمل'' دین موصوف اور ان کے حواری سنبھال کر بیٹھے ہیں جس میں نہ عقیدہ توحید ہے، نہ ایمان بالرسالت ہے، نہ ایمان بالملائکہ والقدر ہے، اور نہ ایمان بالآخرہ ہے نہ عقیدہ عذاب قبر ہے، نہ عقیدہ نزول مسیح ہے اور نہ عقیدہ ظہور مہدی ہے کیوں کہ عقیدہ تو سنت سے ملتا ہی نہیں وہ تو صرف قول و فعل اور عملی زندگی کا نام ہے۔

اور یہ بھی خوب کہ قرآن سنت سے واضح ہوتا ہے ،اور سنت کی دلیل حدیث سے دی کہ ''اوتیت القرآن ومثلہ معہ''[1] کیوں کیا تواتر عملی سے یہ سمجھ نہیں آتا؟ اور سنت تو حدیث سے اخذ ہی کی جاتی کما مر ہے۔ اب ان عبارتوں میں کس قدر تضاد ہے کوئی بھی صاحب عقل کم از کم جناب اور ان کے حواریوں کو عقل مند تو

---

(1) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موصوف کی ذکر کردہ روایت خبر متواتر ہے؟ اگر ہے تو تواتر کا مسمی مل گیا اور اگر نہیں تو خبر واحد ہوئی مگر اس کی قبولیت کی تین شرطیں موصوف نے لکھی ہیں وہ اس روایت میں کہاں ہیں؟

نہیں کہے گا۔

منکر سنت کو لغو اور بے بنیاد گفتگو کرنے والا تو کہہ دیا مگر خود کتنی سنتوں کے منکر ہیں کبھی سوچا؟ خود نے سنت کو جو خود ساختہ معنی پہنائے ہیں وہ کس ائمہ حدیث کی مستند کتاب سے لئے ہیں کیا اس حرکت سے سنتوں کا انکار لازم نہیں آتا؟حافظ ابن رجب رحمہ اللہ سنت سے عقیدہ و عمل دونوں کا اثبات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

‘‘فعلیکم بسنتی۔۔۔ فیشمل ذلک التمسک بما کان علیہ ھو وخلفاؤہ الراشدون من الاعتقادات والاعمال والاقوال وھذہ ھی السنة الکاملة لھذا کان السلف قدیماً لا یطلقون اسم السنة الا علی ما یشمل ذلک کلہ۔۔۔’’

(جامع العلوم والحکم)

ترجمہ:‘‘حکم رسول کہ (تم میری سنت لازم پکڑو)شامل ہے، اعتقادات، اعمال میں اس (کامل و مکمل) تمسک کو جو نبی مکرم اور آپ کے اصحاب سے معمول بہ ہے یہی کامل سنت ہے اور اسی لئے قدیم سلف صالحین لفظ سنت کا اطلاق ان تمام باتوں پر کرتے تھے(عقیدہ ،قول، عمل)

سنت کے بارے میں یہ لکھنا کہ اس کا مرجع احادیث نہیں تواتر عملی ہے ، اس میں بھی موصوف سارے ائمہ حدیث سے منفرد اور شاذ شخصیت دکھائی دیتے ہیں اس مسئلہ میں بھی ان کے پاس ‘‘ائمہ حدیث کی مستند کتب’’سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ احادیث قطعی نہیں ہیں اور سنت قطعی ہے تو پھر سنت ایک ہی مسئلہ میں

الگ الگ کیسے ہو جاتی ہے ؟ یہ معمہ
بھی موصوف کی وفات کے بعد ان کے
حواری اور شاگرد رشید ہی حل کر سکیں
گے۔

غیر قطعی حدیث سے تواتر عملی کی
حجیت کی دلیل (جو قطعی ہے) کیسے مل
جاتی ہے یہ گورکھ دھندا سمجھ میں نہیں
آتا خود لکھتے ہیں کہ تواتر عملی سے مراد
نبی ﷺاور آپ کے خلفائے راشدین اور صحابہ
کا عمل ہے اور اس کی دلیل ‘‘فعلیکم
بسنتی۔۔۔۔’’سبحان اللہ !اب شاید یہ حدیث
قطعی ہوگئی۔ مگر دلیل کیا ہے ؟ کسی
امام حدیث نے اپنی مستند کتاب میں لکھا
ہو جس سے‘‘مبادی تدبر حدیث’’(جناب کے
زعم میں)ماخوذ ہے۔

موصوف منکر سنت سے شکوہ کرتے
ہیں جب سنت نہیں تو قرآن کیوں حجت
ہے؟ مگر ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ
میں اور ان میں کیا فرق ہے؟ ذرا یہ کسی
ائمہ حدیث کی مستند کتب سے دکھا دیں۔

جب سنت کا معنی ہی خود ساختہ
(اصطلاحاً) بنالیا تو ا ب اسے ماننا گھر کی
لونڈی بنانے کے مترادف ہے جب چاہا جیسے
چاہا جدھر چاہا گھما دیا،اور بس!نہ جانے
قرآن جو سنت سے واضح ہوتا ہے موصوف
کے ہاں کیسے حجت بن گیا؟ کیوں کہ سنت
تواتر عملی پر موقوف ہے اور تواتر عملی
کی دلیل حدیث ‘‘فعلیکم بسنتی’’ ہے۔ جو
موصوف کے ہاں قطعی نہیں ہے اگر یہ
قطعی نہیں تو پھر سنت کی قطعیت کا

دعوی بے کار ہے اور پھر یہ کہنا بھی ‘‘ کہ قرآن سنت سے واضح ہوتا ہے’’ دیوانے کی بڑ کے سوا کچھ نہیں ہے واللہ المستعان

آمین بالجہر وبالسر، ہاتھ باندھنا، نہ باندھنا اگر ہر عمل سنت ہے ،سنت ہونے کا امکان ہے اور قرائن و دلائل بھی اس کے ہیں تو ا ب اس صورت میں یہ ‘‘دعوی طفلیہ’’ کرنا کہ سنت قطعی ہے ،ذہنی فتور و دماغی انتشار و فکری تضاد کے سوا کچھ نہیں ہر عاقل و فہیم اس دعوی کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اس دعوی کی دلیل بھی درکار ہے کہ کسی ‘‘امام حدیث نے اپنی مستند کتاب’’ میں لکھا ہو۔

ہمیں یقین ہے کہ موصوف اس وسعت ظرفی کے باوجود ساری زندگی‘‘مروجہ فقہ’’ کی پابندی کرتے ہوئے اسی کی طرز پر نماز [1]پڑھتے رہے ہوں گے، جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی کیپٹن مسعود احمد عثمانی وغیرہ کو دوسروں پر تنقید کرتے ہوئے انہیں کبھی اپنے دامن پر تقلید کی نجاست نظر نہیں آئی۔

دلائل و قرائن کی بات کر کے موصوف نے یہ مان لیا کہ ‘‘تواتر عملی’’ بھی مختلف ہوتا ہے اور ایک ہی وقت میں جدا جدا دکھائی دیتا ہے اب نہ جانے یہ تواتر

---

[1](؟)اور شاید اس طرح نماز پڑھنا بھی جناب کی اہم مجبوری ہے کیوں ؟حقیقتاً موصوف نے اس کتاب میں فقہ حنفی کوفی کی ہی ترجمانی کی ہے ۔کما لا یخفی علی اہل العلم

عملی نبیﷺ اور آپ کے خلفائے راشدین و صحابہ کے عمل میں محصور رہا یا برصغیر پاک و ہند کے ہرایرے غیرے نتھو خیرے سے بھی ملنا شروع ہوگیا ۔اس کا فیصلہ موصوف کے حواری ہی کر سکیں گے۔

بہر حال اس بحث میں یہ ثابت ہو گیا کہ موصوف کی‘‘ مبادی تدبر حدیث’’ (جسے مبادی تمسخر حدیث کہنا چاہیئے) کسی بھی ‘‘امام حدیث کی مستند کتاب’’ سے ماخوذ نہیں ،بلکہ موصوف کی تجدد پسندی نے ان کے افکار کو‘‘اضغاث احلام’’ کا لبادہ اوڑھا کر یہ باور کروا دیا کہ موصوف بہت ہی قابل ذہین فطین اور علمی صلاحیتوں سے بھر پور شخصیت ہیں جو ائمہ محدثین کرام کی بھی اصلاح کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایاتھا:

‘‘اخوف ما اخاف علی امتی منافق علیم اللسان یجادل بالقرآن’’

(جامع بیان العلم ابن عبدالبر)

‘‘مجھےاپنی امت پر سب سے زیادہ اس منافق کے مسلط ہوجانے کا خوف و خطرہ ہے۔ جو قرآن کو دلیل بنا کر جھگڑا کرے گا اور انتہائی چرب زبان ہوگا‘‘

اصول اصلاحی:

قرآن اور حدیث و سنت کا باہمی تعلق

لکھتے ہیں :قرآن اور حدیث و سنت میں نہایت گہرا باہمی تعلق ہے۔ ان کا معنوی تعلق روح اور قالب کا اور ظاہری تعلق

اجمال و تفصیل کا ہے۔ دونوں دین کے قیام
کے لئے یکساں ضروری ہیں۔ دونوں کا اتباع
اور احترام یکساں واجب ہے۔
قرآن نے دین کے کلیات اور اصول و
مبادی پر جامع بحث کی ہے ، لیکن کسی
باب میں بھی تفصیلات اس میں نہیں
ملتیں،ان کے لئے سنت اور حدیث کی طرف
رجوع کرنا پڑتا ہے۔ (صفحہ۳۳)
آپ ﷺنے جو کچھ لوگوں کو بتایا اور
سکھایا اس کو آپ کے فرائض نبوت سے نہ
تو خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا
درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا جا
سکتا ہے۔ (صفحہ۳۴)
جس طرح نبی ﷺنے احکامی آیات کے
اجمالات کی وضاحت فرمائی اسی طرح
حکمت کے دقیق اشارات قرآن میں ہیں ان
کی بھی وضاحت فرمائی۔ یہی چیز
ہے جس کی بابت نبی ﷺنے فرمایا:
‘‘الانی اوتیت القرآن ومثلہ معہ’’
(الکفایہ)
‘‘دیکھو مجھے قرآن دیا گیا اور اس کی مثل
اور بھی’’
اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سنت
مثل قرآن ہے ،سنت اپنے ثبوت میں بھی
ہم پایہ قرآن ہے قرآن امت کے قولی تواتر
سے ثابت ہے اور سنت عملی تواتر سے ہے۔
(صفحہ ۳۵)

اصول اصلاحی کا تجزیہ

مذکورہ باب قائم کر کے موصوف نے
‘‘حدیث اور سنت’’ کو باہم مترادف قرار

دے دیا ہے، اور ان کے درمیـــــــان‘‘ زمین و آسمان’’ کے فـرق کو مٹا دیا ہے۔ سـوال یہ پیـدا ہوتا ہے کہ اس نـئے زاویے کو صـحیح مانا جـــائے یا اس سے قبل کو دلیل کس پر ہے؟ تو پھر اپنی ‘‘مبادی تدبر حدیث’’(مبادی تمسـخر حـدیث) کو مکمل طـور سے ’’ائمہ حدیث کی مستند کتـابوں ’’ سے مـاخوذ کہنا کس قدر جسار ت ہے۔

اگر دونـــوں میں‘‘ زمین و آســمان ’’ کا فــرق ہے اور دین میں دونــوں کا مقـــام و مرتبہ‘‘ الگ الگ’’ ہے تواس باب نمـبر ۲ کے تحت وہ ختم کیسے ہوگیـــا؟ کیا موصــــوف محدَّث و ملہم من اللہ ہیں؟

حـدیث و سـنت کو ایک ہی معـنی میں لے کر یہ کہنا کہ قـــــرآن کیســــاتھ ان کا بـــاہمی گہرا تعلق ہے ۔ســـوال یہ ہے کہ کس طـرح ؟جب یہ لکھا جا چکا کہ حـدیث غیر قطعی اور سـنت و قـرآن قطعی ہیں تو پھر قطعی اور غـــــیر قطعی آپس میں کس طـــرح بـــاہم گہرا تعلق رکھ ســکتے ہیں؟ موصـــوف یہاں‘‘ ائمہ حـــدیث کی مســـتند کتابوں’’ کی طـرف لـوٹ گـئے ہیں نہ جانے دانستہ یا ناد انستہ طورہ پر؟

قـرآن اور حـدیث و سـنت! موصـوفہ کی پچھلی گفتگو اور تحریر سے تین چیزیں قرار پــــــاتی ہیں مگر یہاں جا بجا لکھا ہے یہ دونـوں ہیں۔ یہ دونـوں ہیں۔ گویا حـدیث و سنت ایک ہی ہے اور قرآن (دوسر چیز) مل کر دونـوں حجت بن گـئے ، واجب الإتبـاع ہو گئے اور ان میں کوئی ‘‘ زمین و آسمان’’ کا فرق نہیں رہا۔ الحمدللہ

‘‘مولانا کا کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے’’
کسی نے بھی بطور اصطلاح کے حدیث و سنت میں کوئی فرق ذکر نہیں کیا ،بلکہ شیخ مصطفیٰ سباعی مرحوم لکھتے ہیں:
‘‘اس تعریف کے لحاظ سے بعض محدثین کے نزدیک حدیث اور سنت دونوں ایک ہی چیز ہیں’’ (السنہ ومکانتها مترجم)
موصوف (اصلاحی صاحب)لکھتے ہیں قرآنی احکام کی تفصیل کے لئے حدیث و سنت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔
یقیناً اب مولانا صاحب(اپنے دعوی کے بر خلاف) حدیث و سنت میں فرق کرنے کے بالکل خلاف ہوگئے ہیں بلکہ اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ قرآنی احکام کی تفصیل حدیث و سنت میں ملتی ہے اور اگر انہیں حجت نہ مانا جائے تو قرآن کا بھی انکار لازم آتا ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جو تمام ‘‘ائمہ حدیث کی مستند کتب’’ میں موجود ہے۔ امید ہے کہ مولانا کے حواری بھی ان کے اس قول کی پاسداری کریں گے، اور حدیث و سنت میں کوئی فرق نہیں کریں گے۔ مولانا کا یہ لکھنا کہ ‘‘آپ ﷺ نے جو کچھ لوگوں کو بتایا اور سکھایا ہے۔ اس کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں نہیں گرایا جا سکتا’’۔
بالکل صحیح ہے اور یہی حدیث و سنت کا مقام ہے اسی کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا کے پسندیدہ خطیب بغدادی ؒ نے ‘‘الکفایہ’’ میں باب قائم کیا ہے‘‘ ما جاء فی التسویة بین حکم کتاب اللہ وحکم سنة رسول اللہ فی وجوب العمل ولزوم التکلیف ’’یعنی

کتاب اللہ کا حکم اور رسول اللہ کی سنت کا حکم عمل کے وجوب اور لزوم تکلیف میں برابر ہے۔

آگے پھر خطیب بغدادی ؒ نے اس مسئلے کے حق میں دلائل جمع کئے ہیں اور تواتر عملی نہیں بلکہ احادیث نقل کی ہیں اور ان احادیث میں مسئلہ رجم کی حدیث بھی نقل کی ہے اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ بھی حقیقتاً قرآن کی تفصیل میں شامل ہے، اور عملی اعتبار سے واجب العمل ہے۔

نیز حسان بن عطیہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ جبریل قرآن کی مثل سنت بھی لے کر نازل ہوتے تھے۔ اب دیکھیں مولانا[1]اور ان کے حواری اپنے اس مؤقّف پر قائم رہتے ہیں یا نہیں کہ قرآن اور حدیث و سنت یہ دونوں (تینوں نہیں) ایک ہی چیز ہیں اور ان کا معنوی تعلق روح اور قالب کا ہے۔

امام ابن عبدالبر ؒ نے بھی ‘‘جامع بیان العلم ’’ میں ایک باب قائم کیا ہے‘‘ موضع السنة من الكتاب وبيانهاله’’ اور قرآن و سنت کے باہمی ربط و حجیت کو ثابت کیا ہے مزید یہ کہ حدیث و سنت میں کوئی فرق نہیں رکھا بلکہ سنت کی دلیل روایت حدیث ہی کو بنایا ہے۔

آگے مولانا نے حدیث ‘‘الا انی اوتیت القرآن [illegible]’’ نقل کر کے مزید اس بات کو

---

[1] (؟)مولانا تو چلے گئے ہیں اب حواری ہی بچے ہیں۔

تقویت دی ہے کہ حدیث و سنت میں کوئی
فرق نہیں نیز یہ کہ اس میں قرآن کی
تفصیل و دقیق اشارات کی توضیح ہے اور
یہ مثل قرآن کے واجب الاتباع ہے۔ ہمیں
مولانا کے اس مؤقف سے پوری طرف اتفاق
ہے۔ اگر مولانا قائم رہیں مگر۔۔۔ ہیہات
۔۔۔۔اور یہاں مثل قرار دینا چہ معنی
دارد۔ شاید موصوف اپنے اس مؤقف سے
بھی پھر گئے ہیں کہ سنت صرف عملی
چیزوں کا نام ہے عقیدہ و ایمانیات کو اس
میں دخل نہیں۔مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ
کیوں؟ کیا پچھلا مؤقف کسی ‘‘امام حدیث
کی مستند کتاب’’ سے ماخوذ نہیں تھا؟ اگر
ان سے ماخوذ تھا تو اس سے رجوع کیسا
اور کیا اب بھی یہ کتاب(مبادی تدبر حدیث)
ان کی مستند کتب سے ماخوذ ہی شمار
ہوگی؟

اگر پہلا مؤقف درست ہے تو دوسرا
غلط اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پہلا غلط
اسی طرح قرآن و سنت کو باہم ایک
دوسرے کے مثل قرار دینا بھی غلط (اس
مؤقف کو) آگے پیچھے کرنا ہوگا کیا خیال
ہے؟

‘‘لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا’’

گویا مولانا اور ان کے حواریوں کو یہ
ماننا پڑے گا کہ‘‘سنت ’’ سے بھی عقیدے و
ایمانیات کی بحث حاصل ہوتی ہے کیونکہ
قرآن میں بھی یہ مباحث موجود ہیں اور
سنت قرآن کی مثل ہے اور یہی وہ عقیدے
ہیں جو ‘‘ائمہ حدیث کی مستند کتابوں’’ سے

ماخوذ ہے۔ اور امت مسلمہ کا چودہ سو سال سے اس پر اجماع ہے۔

مولانا کا سنت کو باعتبار ثبوت کے بھی قرآن کے ہم پایہ قرار دینا صحیح ہے۔ مگر قولی تواتر کو قرآن کے ساتھ کر دینا اور عملی تواتر کو سنت کے ساتھ کر دینا محل نظر ہے۔ کیوں کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قول و فعل کا تضاد کوئی عیب نہیں جب کہ قرآن یہ کہتا ہے ''لم تقولون مالا تفعلون'' جو قول ہو وہی فعل ہونا چاہیئے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر قول کا اقرار ہی عمل کی ترغیب دیتا ہے اور عملی زندگی قول کی تائید ہوتی ہے اور اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر یہی مؤقف سامنے آئے گا کہ سنت و قرآن میں فرق ہے خواہ قولی و عمل ہی ہو اور موصوف سنت و قرآن کو ہر طرح واجب الاتباع اور باہم ایک دوسرے کے ہم مثل قرار دے چکے ہیں۔

اور یہ بھی اہل علم و بصیرت پر مخفی نہیں کہ جمع القرآن کے وقت زبانی قرءات (جو حفظ تھی سینے میں) اور جو تحریر تھی قرطاس میں دونوں کو طلب کر کے باہم موازنہ کر کے حتمی شکل میں''الامام''میں ضبط کیا گیا تھا۔ گویا قولی تواتر کافی نہ تھا۔ فافهم

قرآن کو صرف قولی تواتر سے ماخوذ قرار دینا مولانا کے مبلغ علم کی نقاب کشائی ہے۔ امام ابو عمر الدانی ؒ نے اپنی

کتاب ''التیسیر ''میں قراء سبعہ کی سندات کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یہ قراءات کس طرح اخذ کی تھیں۔ فلیراجع

اور سنت کو تواتر عملی کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا بھی عجیب منطق ہے جب کہ موصوف پہلے یہ اقرار کر چکے ہیں کہ تواتر عملی سے مراد نبی ﷺ آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ کا عمل ہے کہ دین کا مرکز یہی ہے ،اور یہ بات کہاں سے ملی خود لکھتے ہیں کہ ''فعلیکم بسنتی'' اس کی دلیل ہے اور زیر نظر سطر میں موصوف نے حدیث و سنت کے ''زمین و آسمان'' کے فرق کو ختم کر دیا ہے لہذا یہ خود ساختہ قید کہ''قرآن تواتر قولی سے اور سنت تواتر عملی سے''ماخوذ ہے اس پر مزید یہ کہ اس قید کی کوئی بھی دلیل کسی بھی ''امام حدیث کی مستند کتاب'' سے منقول نہیں۔ پھر بھی یہ دعوی کہ ''میری کتاب ان کی مستند کتب سے ماخوذ ہے اور میں اس میں منفرد نہیں ہوں''۔ دعویٰ محض ہے۔ قولی اور عملی فرق کی قید کے باوجود یہ لکھنا کہ(سنت اپنے ثبوت میں قرآن کے ہم پایہ ہے) ذہنی انتشار و خلفشار کی نشاندہی ہے اور باہم متناقض ہے۔

قرآن و سنت کو تواتر عملی اور تواتر قولی کے حوالے کر دینا حقیقتاً ان احادیث و سنن کا انکار ہے جو مستند کتب احادیث و سنن میں منقول ہیں اور بقول مولانا کے اگر سنت کا انکار صحیح ہے تو پھر قرآن کے ماننے کے بھی کوئی وجہ نہیں۔

اصول اصلاحی:

قرآن اور حدیث و سنت کے بارے میں غیر متوازن خیالات کا آغاز کس طرح ہوا؟

مولانا اس عنوان کے تحت رقم طراز ہیں: ‘‘صدر اول میں روایت حدیث کی روز افزوں مقبولیت کی وجہ سے لوگوں نے بلا تحقیق حدیثیں بیان کرنا شروع کر دیں تو ضعیف احادیث کے توغل نے بعض محتاط لوگوں کے اندر حدیث بیزاری کا رجحان پیدا کر دیا’’۔ پھر سیدنا عمران بن حصین ؓ کے ساتھ ایک شخص کا مکالمے کا ذکر کیا ہے اور حوالہ ‘‘الکفایہ’’ کا دیا ہے۔ (صفحہ ۳۵،۲۶)

‘‘حدیث بیزاری’’کا رد عمل ،دوسری طرف ایک گروہ پر ‘‘قرآن بیزاری’’ کی شکل میں ہوا اور اس کے اندر حدیث کے غلو نے یہ شکل اختیار کر لی کہ بعض لوگوں نے اس کو اعلانیہ قرآن پر ترجیح دینی شروع کر دی۔ چنانچہ مکحول کا ایک قول منقول ہے کہ:سنت جتنی قرآن کی محتاج ہے اس سے زیادہ قرآن سنت کا محتاج ہے۔ (الکفایہ)

سوچنے کی بات ہے کہ اگر قرآن نہ ہوتو سنت کیا کرے گی؟ اس کی عمارت کس چیز پر استوار ہوگی؟ سنت کی اساس تو بہرحال قرآن مجید ہی ہے اس کے بغیر سنت کھڑی نہیں ہو سکتی۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور ہم دونوں کے یکساں محتاج ہیں۔

(صفحہ۳۸)

موصوف کے غیر متوازن خیالات کا تجزیہ

مولانا نے تسلیم کر لیا ہے کہ صدر اول میں حدیث روز بروز مقبولیت کے مدارج طے کر رہی تھی ۔اب مولانا کے ہاں شاید حدیث کو یہ مقام حاصل نہ ہو کیوں کہ ان کے پہلے مؤقف کے مطابق حدیث سنت کا بھی ماخذ نہیں بن سکتی تو گویا مولانا کا مؤقف کے حدیث و سنت میں ''زمین و آسمان'' کا فرق ہے اور حدیث بھی سنت کا ماخذ و مرجع نہیں۔ صدر اول کے مؤقف کے خلاف ہے وہاں اس قسم کی تفریق موجود نہیں تھی۔ صدر اول سے کیا مراد ہے؟ تو مولانا نے خود ہی صحابی رسول عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی محفل کا ذکر کر کے قرون اولیٰ یعنی صحابہ کے عہد کو صدر اول قرار دیا ہے۔ اور اس میں حدیث بہت مقبول تھی(اور متواتر و آحاد کی تفریق بھی نہ تھی)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صحابہ کرام بھی (نعوذ باللہ) بلا تحقیق حدیثیں بیان کرتے تھے؟ یہ حکم شاید صرف مولانا اور ان کے حواری ہی لگا سکتے ہیں جنہیں نہ خوف الٰہی دامن گیر ہے اور نہ ہی اپنے خیالات کے لئے کسی امام حدیث کی مستند کتاب کی ضرورت ہے

ہمیں تو آج ہی معلوم ہوا ہے کہ خود کو ''اہل السنہ'' کہلوانے والے بھی صحابہ

سے عداوت رکھتے ہوئے انہیں ضعیف حدیث کا توغل مچانے والا قرار دے سکتے ہیں!! مگر شاید موصوف اس مسئلے میں منفرد ہیں ‘‘فما لھؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا’’

موصوف کی دھاندلی کی اور حدیث دشمنی کی انتہا دیکھیں کہ صحابہ کو کیا قرار[1] دیا اور معترض علی الحدیث مجہول الحال (منکر حدیث) کو محتاط لوگوں میں شامل کر دیا ‘‘تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ’’

حالانکہ سیدھی سی بات ہے جو حدیث کی روایت میں محتاط ہوگا وہ حدیث سے بیزار نہیں ہوگا، مگر مولانا کی عجیب منطق ہے کہ ایک طرف ‘‘مجہول شخص’’ کو محتاط قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اسے حدیث سے بیزار گردانتے ہیں گویا موصوف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے حواری احتیاط برتتے ہوئے حدیث سے بیزار رہتے ہیں۔فقاتلھم اللہ انی یؤفکون

مولانا نے ‘‘مجہول شخص’’ جو حدیثوں پر معترض اور موصوف کے الفاظ میں احتیاطی بیزار ’’ تھا کے قصے سے جو کچھ مفہوم اخذ کیا ہے وہ مفہوم نہ صاحب‘‘الکفایہ’’ نے اخذ کیا ہے اور نہ ہی صاحب‘‘ الموافقات’’ یعنی امام شاطبی و صاحب ‘‘ جامع بیان العلم’’ یعنی امام ابن عبدالبر نے بلکہ انہوں نے اس شخص کو حدیث پر اعتراض کرنے والا اور صحابی رسول عمران رضی اللہ عنہ بن حصین کو مدلل انداز سے حدیث کا دفاع کرنے والا ثابت کیا ہے اور ساتھ ہی حدیث و سنت

[1] قد بدت البغضاء من افواھھم

کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

صاحب‘‘ الکفایہ’’ نے اس قصہ کو باب‘‘تخصیص السنن لعموم محکم القرآن و ذکر الحاجة فی المجمل الی التفسیر والبیان’’ میں نقل کیا اور اس قصہ سے متصل ہی ایوب سختیانی ؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ‘‘جب تم کسی شخص سے سنت کی بات کرو اور وہ کہے چھوڑو اسے ‘‘قرآن سے نصیحت کرو’’ تو جان لو وہ شخص(منکر سنت) ضال مضل ہے’’۔ یہ قول مذکورہ قصہ کی وضاحت و صراحت کرتا ہے کہ وہ معترض محتاط بالحدیث نہیں بلکہ منکر حدیث و سنت تھا۔

اب نہ جانے موصوف اس کا دفاع کر کے اور صحابہ پر ضعیف حدیثوں کا توغل مچانے کا الزام لگا کر عوام کو کیا کہنا چاہتے ہیں[1]۔

امام ابن عبدالبر ؒ نے اس قصہ کو اپنی کتاب ‘‘جامع بیان العلم وفضلہ’’ میں‘‘ باب موضع السنة من الکتاب وبیانھالہ’’میں ذکر کیا ہے جو اپنے مفہوم میں اور ہمارے (اس شخص کے بارے میں) مؤقف کی تائید میں بالکل واضح ہے
جبھی تو عمران بن حصین ؓ نے اسے ‘‘انک امرؤاحمق’’ کا خطاب دیا تھا۔

اسی طرح امام شاطبیؒ اور ڈاکٹر صبحی صالح کی کتب بھی مسئلہ ھذا کی تفہیم میں رہنمائی کر سکتی ہیں۔

1(?)شاید اپنے اکابرین کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے بہت سے صحابہ کو غیر فقیہ قرار دیا ہوا ہے۔

دوسری بات جو موصوف نے لکھی ہے کہ ‘‘قرآن بیزاری کی شکل میں ہے۔’’ تو پہلے تو ہم یہ غور کر لیں کہ موصوف قرآن سے بیزار کسے قرار دے رہے ہیں اور کیوں؟

مولانا کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث سے ‘‘احتیاطی بیزاری’’ کے رد عمل میں‘‘قرآن سے بیزاری ’’سامنے آئی اور اس کی دلیل امام مکحول[1] و دیگر ائمہ حدیث کے وہ اقوال ہیں جن میں سنت کو قرآن پر حاکم و قاضی قرار دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ مؤقف جو موصوف نے زبردستی کچھ اقوال و واقعات سے اخذ کیا ہے سراسر غلط فہمی، اور عداوت ائمہ حدیث میں گھڑا گیا ہے اور بات کو کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے۔

پہلی بات محتاط لوگوں کو حدیث سے بیزار قرار دینا ان کی خود ساختہ ترجمانی ہے اور ان پر الزام کے مترادف ہے اور اگر وہ واقعی محتاط بالروایہ تھے تو پھر انہیں حدیث سے بیزار کہنا انہیں کفر کی دلدل میں دھکیلنا ہے جو کم از کم مولانا جیسے ‘‘محتاط’’ شخص کو زیب نہیں دیتا۔

قرآن سے بیزاری کا لطیفہ بھی خوب لکھا ہے یہ عجیب بات ہے کہ قرون اولیٰ کے علمی و عملی دور میں کوئی ہمارے بے علمی و بے عملی دور کی طرح کا طرز

---

[1] (؟)گویا ائمہ حدیث کو موصوف نے قرآن بیزار قرار دیا ہے۔ معاذ اللہ

عمل اختیار کرے کہ تُو ایسا کرے گا تو میں ایسا کروں گا۔ سمجھ آسکتا ہے؟ بہت ہی مشکل بات ہے ، اُس دور میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

اور پھر یہ بھی بہت ہی بڑا سنگین الزام ہے جو ائمہ حدیث پر موصوف نے ''محتاط'' انداز میں لگایا ہے ،کیا کسی کے ایک قول کو لے کر اسے قرآن بیزار قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر سنیں موصوف خود بھی قرآن بیزار ہیں کہ انہوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ اگر سنت کا انکار صحیح ہے تو قرآن کے ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں اور یہ بھی لکھا کہ قرآن تو سنت سے ہی واضح ہوتا ہے ،جیسا کہ گزر چکا ہے۔

سونے پہ سہاگہ یہ کہ موصوف اس مؤقف میں کسی ''امام حدیث کی مستند کتاب'' سے کوئی بات نقل نہ کر سکے کہ ائمہ حدیث بھی قرآن بیزار ہوتے تھے۔ ''نعوذ باللہ من ھذہ الھفوات'' اگر قرآن کو سنت کا محتاج کہنا مبالغہ آمیزی و قرآن بیزار ی ہے تو موصوف نے جو لکھا ہے کہ ''قرآن تو سنت سے ہی واضح ہوتا ہے '' اس کا کیا بنے گا؟ یہی کہ موصوف خود ہی اپنے فتوے کی زد میں آئیں گے اور ''قرآن بیزار ''قرار پائیں گے۔

اس بحث میں سب سے مزید ار جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مولانا ام مکحول پر غصہ اتارتے اتارتے ایک مرتبہ پھر حدیث و سنت کے ''زمینی و آسمانی'' فرق کو بھلا بیٹھے ہیں بات حدیث کی کرتے ہیں اور حوالہ ''السنہ'' کا نقل کرتے ہیں اور پھر ستم یہ کہ صاحب

‘‘الکفایہ’’ نے خود بھی اس سے یہ مفہوم مراد نہیں لیا کہ یہ قرآن بیزاری اور مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے اور مولانا پھر ایک مرتبہ ‘‘منفرد’’ ہوگئے۔

خطیب بغدادی کی تبویب سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اقوال سے مراد یہ ہے کہ سنت قرآن کی تشریح و تبیین کرتی ہے اور بس۔

بالکل اسی طرح کی بات امام شاطبی نے کی ہے کہ‘‘ سنت قرآن پر قاضی’’ سے مراد اس کا قرآن پر مقدم ہونا نہیں بلکہ فقط مفسر و مبین ہونا ہے۔ (الموافقات)

لہذا موصوف کا ائمہ حدیث کو قرآن بیزار کہنا انتہا درجہ کی جسارت ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

آگے جو موصوف نے رسول اللہ ﷺ کہ اللہ تعالیٰ پر حاکم ہونے کی بات کی ہے یہ صرف الفاظ سے کھیلنے والی بات ہے اور عوام کالانعام کے جہالت سے لبریز خیالات و جذبات کو ابھارنا مقصود ہے کہ وہ موصوف کے مؤقف کو صحیح باور کر لیں۔

ہمارا موصوف کے مرنے کے بعد انکے حواریوں سے یہ سوال ہے کہ یہ خود ساختہ معنی جو قول مکحول وغیرہ سے آپ کے امام نے اخذ کیا ہے اس کی دلیل کسی‘‘امام حدیث کی مستند کتاب’’ سے پیش کریں ،تاکہ مولانا کا یہ دعویٰ باطل ہونے سے بچ جائے کہ میری اس کتاب میں، میں منفرد نہیں ہوں ۔بلکہ تمام تر اصول و مبادی ‘‘ائمہ حدیث کی مستند کتب’’

سے ماخوذ ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام شاطبی ؒ و امام ابن عبدالبر ؒ و دیگر ائمہ حدیث نے ‘‘السنۃ قاضیۃ علی الکتاب’’ وغیرہ کی جو وضاحت کی ہے وہ آپ کے ہاں قابل قبول ہے یا نہیں؟ اگر ہاں تو بات ختم اور اگر نہیں تو ان کی کتابوں سے حوالہ نقل کر کے انہیں خود ساختہ معنی پہنانا کہاں کی دیانت ہے؟

اگر اس قول سے آپ کے امام صاحب کا مذکورہ مؤقف نکلتا ہے تو پھر ان کے اس قول سے کیا مراد لیا جائے گا کہ ‘‘قرآن تو سنت سے ہی واضح ہوتا ہے’’؟

نیز یہ بھی دیکھ لیں غور کر لیں کہ قرآن کریم کا مرجع و ماخذ قلب رسول اطہر ہے یا نہیں؟ پہلے رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے یا آپ پر نازل شدہ قرآن؟ اگر قرآن مجید نازل نہ ہوتا اور آپ ﷺ کو رسول مان لیا جاتا(جس طرح کہ اب مانا گیا) تو آپ کی شخصیت اور اقوال و عمل کا کیا مقام ہوتا؟ وہ حجت ہوتے یا نہیں؟

اصول اصلاحی

اگر قرآن نہ ہو تو سنت کیا کرے گی؟۔۔۔۔موصوف کی اس مذکورہ عبارت میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ سنت جس سے مکمل[1] دین کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے وہ سنت جس سے قرآن واضح ہوتا ہے اب اس کے لئے پیمانہ قرآن کو بنایا جا رہا ہے گویا موصوف ایک مرتبہ پھر اپنے مؤقف سے

---

[1] یہ الفاظ موصوف ہی کے ہیں۔

پھر گئے ہیں

‘‘سنت کیا کرے گی’’یہ سوال تو سنت کی تعریف میں ہی حل ہو جاتا ہے کہ سنت قول و فعل رسول اللہ ﷺ کا نام ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو کتاب دی تھی کہ ان کی سنت کو اساس مل جائے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو قابل قبول نہیں کیوں کہ قرآن کے خلاف ہے اور اگر جواب نفی میں ہے تو ثابت ہوا پیغمبر کو اپنی سنت کے لئے کتاب اللہ کی اساس کی ضرورت نہیں وہ خود بنفسہ حجت و دلیل ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء کا انحصار ساری عمر اپنی سنت پر ہی رہا ہکیوں کہ ان کا عمل دینی اعتبار سے من جانب اللہ وحی ہوتا ہے۔سورہ نساء میں ہے:

‘‘ٻ ٻ ڀ ڀ ڀ ڀ ٺ ٺ ٺ ٺ ٿ ٿ’’ (النساء۱۶۳)

‘‘ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے نوح ؑ اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف(وحی)کی تھی۔’’

اس آیت میں نبی ﷺ کی وحی کو نوح ؑ اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء کی وحی سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں سیدنا ابراہیم اور سیدنا مسیح اور داؤد ؑ کے سوا باقی کسی نبی کے متعلق کسی کتاب کا ذکر نہیں[1] ۔ ان کی وحی از قسم سنت

---

[1] (؟)لہٰذا سنت کے لئے‘‘کتاب’’ کی اساس فراہم کرنا بلا

ہی تھی نبی ﷺ کی وحی کو جب وحی جلی اور خفی دونوں سے تشبیہ دی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ آپ پر دونوں قسم کی وحی نازل کی گئی ہے۔

علامہ موسیٰ جار اللہ نے فرمایا تھا:

‘‘فالسنن فی الشرائع والقوانین اصل الاصول وھی فی شرع الاسلام اصل اول بین الاصول الاربعۃ والکتاب الکریم یؤید الاصل الاول ویثبتہ’’

(کتاب السنة، بحوالہ حجیت حدیث از مولانا محمد اسمعیل سلفی)

ترجمہ:‘‘سنن ،شرائع اور قوانین الٰہی میں اساس ہیں اور شریعت اسلامیہ میں ادلہ اربعہ میں سے سنت دلیل اول ہے اور قرآن مجید اس اصل اول (دلیل اول)کی تائید کرتا ہے، اس کا اثبات کرتا ہے ’’

امام شافعی ؒ اور امام خطیب بغدادی ؒ وغیرہ نے جوابواب قائم کیے ہیں کہ‘‘عموم قرآن کی تخصیص وتحدید اور خصوص قرآن کی تعمیم حدیث و سنت کر سکتی ہے’’ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ سنت بنفسہ حجت قطعیہ ہے اور اسے (ہر ہر مسئلہ میں) کتاب اللہ کی اساس کی ضرورت درکار نہیں ہوتی۔ مولانا موصوف بھی سنت کی قطعیت کے قائل ہیں مگر یہاں اسے قرآن کے بغیر کھڑا نہ کر سکنے کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر اپنا مؤقف بدل گئے اور قطعیت سنت جس سے قرآن بھی واضح ہوتا ہے اس کا انکار کر بیٹھے اور گویا ان کے لئے

دلیل ہے۔

(اپنے الفاظ میں) اب قرآن کو ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہی۔

امام ابن عبدالبر ؒ نے ‘‘جامع بیان العلم’’ میں ایسے واقعات نقل کئے ہیں جن سے حدیث و سنت کی مستقل حجیت واضح ہوتی ہے۔ چاہے اس میں بیان کر دہ مسئلہ قرآن میں ہو یا نہ ہو۔

اب دیکھتے ہیں مولانا کے حواری اس کا کیا جواب دیتے ہیں کہ یہ سنت ابن عبدالبر نے کہاں کھڑی کی ہوگی؟

امام ابن قیم ؒ نے‘‘اعلام الموقعین’’میں ‘‘زیادۃ السنة علی القرآن وحکمھا’’ کا باب قائم کر کے ایسے لوگوں کا رد کیا ہے۔ جو سنت میں وارد احکام کی اساس قرآن میں تلاش کرتے ہیں اور اسے قرآن سے زائد بتلا کر رد کر دیتے ہیں۔

اور پھر اپنے مؤقف کی وضاحت میں‘‘السنة مع القرآن علی ثلاثہ اوجہ’’ اور انواع دلالة السنة الزائدۃ عن القرآن’’ اور‘‘بیان الرسول علی انواع’’ اور ‘‘تخصیص القرآن بالسنة جائز’’ وغیرہ کے عنوان قائم کر کے بھر پور تفصیل سے ثابت کرتے ہیں کہ سنت بنفسہ حجت ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات قرآن سے زائد بھی ہوتی ہے۔اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

‘‘واین قال رسول اللہ اذا جاءکم حدیثی زائدا علی مافی کتاب اللہ فردوہ ولا تقلبوہ فانہ یکون نسخالکتاب اللہ؟ ۔۔۔۔ کیف یسوغ ردسنن رسول اللہ بقواعد قعدتموها انتم وآبائکم ما انزل اللہ بھا من

سلطان؟’’

مفہوم یہ ہوا کہ سنت زائد علی القرآن بھی دکھائی دے تو اس کے رد کی کوئی دلیل نہیں[1] بلکہ وہ بنفسہ حجت و دلیل ہے باقی سب قواعد خود ساختہ ہیں جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اسی طرح کی بات امام شاطبی نے ‘‘الموافقات’’ میں کی ہے۔

موصوف کے پہلے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف سنت کو ‘‘منزل من اللہ’’ نہیں سمجھتے اور اسے قرآن مجید کی اساس قرار دیتے ہیں مگر کیا کہئے کہ خود آگے لکھتے ہیں: یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔۔۔ اور ہم دونوں کی یکساں محتاج ہیں۔

اب کسے مانیں اور کسے نہ مانیں کہ جناب شیخ کا قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی؟

اگر سنت ‘‘منزل من اللہ’’ نہیں ہے تو پھر موصوف کے ہاں مثل قرآن حجت کیسے ہوگئی؟ اور اگر ‘‘منزل من اللہ’’ ہے (جیسے کہ موصوف کو بھی اقرار ہے) تو پھر وہ قرآن کی اساس کی محتاج کیوں؟ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایک مستقل مطاع کی ہے جس کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے اور بس۔

‘‘ٹ پ ٻ ٻ ڀ پ’’ (النساء: ۸۰)

‘‘رسول کی اطاعت ہی تو اللہ کی اطاعت ہے’’

کیا ہم سوال کر سکتے ہیں کہ ‘‘سنت

---

[1] (؟) بشرطیکہ وہ سند صحیح ومعتبر ثابت شدہ ہو

کی اساس قرآن ہے’’ اس مؤقف پر جناب کے پاس‘‘ ائمہ حدیث کی مستند کتب’’ سے کیا دلیل ہے؟ یا پھر وہ اس میں ایک مرتبہ پھر منفرد ہوگئے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

‘‘ڦ ڦ ڦ ڦ ڄ ڄ ڃ ڃ ڃ ڃ ڃ ڃ چ چ
چ چ چ چ چ چ ڇ ڍ’’

(النساء۱۱۵)

سبیل المومنین کی مخالفت خود رسول اللہ ﷺ کی مخالفت ہے، اور اس مخالفت کا نتیجہ جہنم میں داخلہ ہے۔

اصول اصلاحی:

حدیث و سنت قرآن کی ناسخ نہیں ہوسکتی

اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں ‘‘اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ امت مسلمہ میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے غالی فتنہ پردازوں کے مقابل میں امت کی ہمیشہ صحیح راستے کی رہنمائی کی ہے۔۔۔’’

حدیث کے سب سے بڑے رازداں اور سب سے بڑے خادم امام احمد بن حنبل ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں صحیح نقطہ نظر واضح فرمایا۔

ان سے سوال کیا گیا(اس قول سے متعلق)کہ ‘‘السنة قاضية على الكتاب’’ توانہوں نے فرمایا بھئی یہ کہنے کی میں جسارت نہیں کر سکتا۔ سنت تو قرآن کی تفسیر کرتی ،اس کی تعریف کرتی اور اس

کی مجمل باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔
(الکفایہ،صفحہ۳۹)

یہ سوال بالکل خارج از بحث ہے کہ کوئی حدیث یا سنت قرآن کی ناسخ ہو سکے۔ سنت اور حدیث کی اہمیت مسلم ہے لیکن ان کے قرآن پر حاکم ہونے کا دعویٰ باطل ہے۔

اس میں(یعنی حدیث میں) ضعف کے اتنے پہلو موجود ہیں کہ اس کا قرآن جیسی قطعی الدلالۃ چیز کو منسوخ کردینا بالکل خلاف عقل ہے۔ (صفحہ ۴۰)

سنت اگرچہ ان کمزوریوں سے محفوظ ہوتی ہے لیکن وہ قرآن کے کسی حکم کی ناسخ اس وجہ سے نہیں ہو سکتی کہ پیغمبر ﷺ کو یہ حق سرے سے حاصل ہی نہیں تھا کہ آپ قرآن کے کسی حکم میں سرمو تبدیلی کر سکیں۔

‘‘ ٹ ٹ ٹ ٹ ٹ ڈ ڈ ڤ ڤ’’
(یونس۱۵)

‘‘کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں’’

ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن میں موجود ہیں۔ (صفحہ ۴۰)

نسخ القرآن بالحدیث کا تجزیہ:

مذکورہ قلمی موشگافی کے ضمن میں ہماری یہ عرض ہے کہ موصوف نے خود کو منفرد رکھتے ہوئے قول امام احمد سے خود

ساختہ معنی کشید کر لیا ہے اور دیگر تمام ائمہ حتی کہ خود صاحب ''الکفایہ'' (جنہوں نے یہ قول اور دیگر اقوال نقل کئے ہیں) سبھی کو ''غالی فتنہ پرداز'' قرار دے دیا ہے، اور غالباً یہ انہی کی جسارت منہ زور ہے کہ جو دل میں آئے لکھ مارا اور یہ نہ دیکھا کہ اس ''جسارت''کی غلاظت مغلظہ کہاں کہاں جا پڑتی ہے۔

صاحب''الکفایہ'' نے قول بھی باب''تخصیص السنن لعموم محکم القرآن وذکر الحاجة فی المجمل الی التفسیر والبیان'' میں نقل کیا ہے جس سے خود بخود صاحب کتاب کے ہاں اس کا معنی متعین ہو جاتا ہے، اور کسی اصلاحی کی اصلاح کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ امام احمد بن حنبل ؒ کے ہاں بھی صرف الفاظ ہی کا فرق ہے ورنہ وہ بھی اسی بات کے قائل ہیں جس کے ہمیشہ سے اہل علم قائل رہے ہیں۔ اور پھر''السنة قاضیة علی الکتاب'' وغیرہ کا معنی امام شاطبی وغیرہ نے متعین کر کے وہی بتایا ہے کہ سنت قرآن کی تعریف، تبیین اور تفسیر کرتی ہے اور بس۔ موصوف نے بلا دلیل ہی امام احمد ؒ کے قول کو ''صحیح نقطہ نظر ''قرار دے دیا ہے اور دیگر ائمہ کو ''غالی فتنہ پرداز'' جب کہ موصوف اس مسئلہ میں بھی کسی امام کی مستند کتاب ''سے کوئی بات نہ نقل کر سکے۔ آخر کیوں ؟

کیا موصوف ہر مؤقف میں ‘‘منفرد’’ ہیں؟ مگر وہ خود کو منفرد ماننے کو تیار بھی نہیں۔ فیاللعجب

موصوف یہ لکھنے کے بعد بھی کہ ‘‘سنت [1] سے قرآن واضح ہوتا ہے ’’سنت سے ہی پورا مکمل دین کا ڈھانچہ بنتا ہے’’ کیا امام احمد ؒ کے قول میں موجود اس جملے پر غور نہیں کریں گے کہ سنت‘‘تعرف الکتاب’’ کتاب کی تعریف کرتی ہے، تعارف کرواتی ہے۔

اس پر اگر موصوف غور کر لیتے تو سمجھ لیتے کہ قرآن کے تعارف میں بھی اصل سنت ہی ہے ،اب اس کا مقام کیا ہوگا یہ بالکل واضح ہے کہ‘‘السنة قاضية على الكتاب’’ امام احمد ؒ نے صرف اس لفظ سے احتراز کیا۔

موصوف کا یہ لکھنا کہ یہ سوال ہی بالکل خارج از بحث ہے کہ کوئی۔۔۔۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام احمد کے مذکورہ قصے میں جو سوال تھا وہ نسخ القرآن بالحدیث والسنہ سے متعلق تھا؟ اگر نہیں تو پھر موصوف نے اس سے استدلال کیوں کیا؟ جب سوال تھا ہی نہیں تو خارج از بحث ہی ہوا موصوف نے جانے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ شاید حدیث و سنت کے مقام کو کم کرنا چاہتے ہیں، جو کہ موصوف کے ہاں بھی ‘‘منزل من اللہ’’ ہے۔

سنت و حدیث کے قرآن پر حاکم ہونے پر جو موصوف نے اعتراض کیا ہے اس کا جواب

---

[1]) اس قول سے جناب خود بھی غالیہ فتنہ پرداز قرار پاتے ہیں۔ فافهم

ہم زیر نظر سطور میں اور اس سے قبل کی تحریر میں(الحمدللہ) دے چکے ہیں۔

حدیث میں ضعف کا دعویٰ کر کے موصوف نے سنت اور حدیث کو ایک مرتبہ پھر الگ الگ قرار دے کر زمین و آسمان کا فرق واضح کر دیا ہے۔ شاید موصوف بھول کر ایک مرتبہ پھر اپنا مؤقف بدل چکے ہیں۔

موصوف کا اعتراض بے موقع و بے محل ہے۔ کیوں کہ بات ضعیف حدیث سے ہی متعلق نہیں بلکہ صحیح حدیث سے متعلق کرنا ہے۔ اور ہر صاحب علم جانتا ہے کہ ضعیف حدیث کی کیا حیثیت ہے۔ اور صحیح کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ ۔موصوف کے ہاں شاید حدیث صرف ضعیف ہی ہوتی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ کبھی کبھی سنت کے قائم مقام کیسے ہوجاتی ہے؟ قرآن کی تفصیل میں اس کی طرف رجوع کیوں کیا جاتا ہے؟

یہ بھی خوب لکھا کہ حدیث سے قرآن کا نسخ خلاف عقل ہے۔ مثلاً کس طرح؟ شاید موصوف کے حواری اس کی کوئی وضاحت کر سکیں ،مگر وضاحت کرتے ہوئے یادرہے کہ آپ کے امام موصوف نے قرآن اور حدیث و سنت دونوں کو اللہ کی جانب سے (نازل شدہ) تسلیم کیا ہے۔

جہاں تک عقل کا مسئلہ ہے تو یہ بھی جناب ہی بتادیتے کہ کس کی عقل جو کسی مسئلہ میں ائمہ حدیث ''سے منفرد'' نہ ہوں ان کی ،یا کہ ہر کسے

باشد کی؟

بس موصوف کا اعتراض اتنا ہی ہوا کہ نسخ القرآن بالحدیث والسنہ عقل کے خلاف ہے، نہ قرآن کے خلاف، نہ حدیث و سنت کے خلاف اور نہ ‘‘ائمہ حدیث کی کسی مستند کتاب’’ کے خلاف۔ سبحان اللہ! سنت کو کمزوریوں سے پاک قرار دے کر بھی مولانا اسے نہیں مانتے، کیوں؟ حدیث میں تو چلو ضعف تھا مگر یہاں کیا ہے؟[1] اور ایک مرتبہ پھر سمجھ آیا کہ سنت و حدیث میں ‘‘زمین و آسمان’’ کا فرق ہے؟

لکھتے ہیں: پیغمبر ﷺ کو سرے سے یہ حق حاصل ہی نہیں تھا کہ وہ قرآن کے کسی حکم میں سرمو تبدیلی کر سکیں اور دلیل:

‘‘ ٺ ٿ ٽ ٹ ٺ ٹ ٽ ڤ ڦ’’الایۃ

اب یہ عجیب منطق والٹی گنگا ہے کہ مولانا کبھی قرآن کو سنت کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی سنت کو قرآن کی اساس کا محتاج بنا ڈالتے ہیں، دلیل مانگو تو کوئی نہیں صرف اپنی عقلیات کے گھوڑے دوڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔

‘‘نسخ کا معنی تبدیلی’’ یہ بھی محل نظر ہے۔ اور جب سنت کو یہ اختیار ہے کہ وہ قرآن کی تعریف و تعارف پیش کر سکتی ہے تو پھر نسخ کا اختیار اس سے چھیننا کس دلیل سے ہے؟ سنت جتنا چاہے قرآن بیان کرے ہمیں کیا معلوم ہمارا مرجع و ماخذ تو صرف سنت ہی ہے اور موصوف

---

[1] یہ خود ساختہ موقف تا قیامت متزلزل رہے گا ان شاءاللہ

بھی مانتے ہیں کہ قرآن تو سنت ہی سے واضح ہوتا اور سنت کمزوریوں سے پاک بھی ہے۔

پیش کردہ آیت دلیل بنتی ہی نہیں کیوں کہ اس میں ’’من تلقاء نفسی‘‘ کی قید ہے جو نفسانی اختیار ختم کرتی ہے نہ کہ اللہ کا دیا ہوا اختیار ، وہ اختیار تو رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔ اسی آیت میں ہے ’’ان اتبع الا ما یوحی الی‘‘ میں جو بھی کرتا ہوں (باعتبار دین کے) وہ اللہ کی وحی ہے اور بس۔ ترتیب مصحف میں فاتحہ کو مقدم کرنا اور علق کو مؤخر کرنا ترمیم و تبدیلی ہے یہ اسی وحی کے اختیار دینے سے کی تھی۔ فافہم

اب اس اختیار میں ناسخ و منسوخ بھی ہے، تعریف و تعارف بھی اور تبیین و تشریح بھی۔ موصوف کو رسول اللہ ﷺ سے یہ اختیارات چھیننے کا کوئی اختیار نہیں ہے، الا یہ کہ دائرہ اسلام سے ہی نکل جائیں۔ اعاذنا اللہ منہ

علماء سلف صالحین نے نسخ القرآن بالسنہ کے بجائے ’’سنت سے قرآن کے حکم کی تحدید و تخصیص‘‘ کے عنوانات اپنی کتابوں میں قائم کئے ہیں ،مثلاً امام شافعی ؒ نے ’’ الرسالہ‘‘ میں خطیب بغدادی ؒ نے ’’الکفایہ‘‘ میں اور امام شاطبی ؒ ’’الموافقات‘‘ وغیرہ میں۔ نیز امام ابن قیم ؒ نے بھی ’’اعلام الموقعین‘‘ میں اسی طرح باب قائم کیا ہے۔

بعض علماء نے اسی سے نسخ القرآن

بالسنة پر بھی استدلال کیا ہے، کیوں کہ لفظ ''نسخ'' کئی معنوں کا متحمل ہے۔ جس کے مفہوم میں تحدید و تخصیص بھی آتی ہے۔ شیخ مصطفیٰ سباعی مرحوم نے فقہائے احناف کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ نسخ القرآن بالسنة کے قائل ہیں اور ''لا وصیة لوارث''(ا لحدیث) وغیرہ ان کی دلیل ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۰ اور سورہ نساء کی آیت ۱۵ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بعض صورتوں میں حدیث و سنت کو قرآنی حکم کی تحدید و تخصیص کرنے والی کے ساتھ ساتھ ناسخ بھی تسلیم کیا جائے۔ واللہ اعلم

نیز مولانا کا ناسخ و منسوخ کو مطلقاً صرف قرآن میں محصور کردینا بھی محل نظر ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن و سنت دونوں کے مطالعہ سے ہی ناسخ و منسوخ
کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے۔

اصول اصلاحی:

کیا قرآن کے کسی حکم کی تخصیص حدیث و سنت سے ہو سکتی ہے؟

اس عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں:'' قرآن کا کوئی عموم محدود و ممیز ہو جائے اور کوئی ایسی چیز شامل نہ ہو کہ لفظ کے مفہوم اور آیت کے منشا کے خلاف

ہو تو تخصیص حدیث و سنت اور قیاس و اجتہاد سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور اگر ایسی کوئی چیز نکل جاتی ہے، جو لفظ کے مفہوم میں واضح طور پر شامل ہے۔ اور اس کے لئے بالکل الگ حکم بیان ہوتا ہے تو یہ تخصیص نہیں بلکہ نسخ ہے اور نسخ کا اختیار پیغمبر کو حاصل نہیں۔ پہلی تخصیص کی مثال یہ ہے کہ چوری پر قطع ید کے عام حکم کی تخصیص رُبع دینار والی روایت سے کی گئی ہے۔ (متعلقہ آیت سورہ مائدہ آیت ۳۸ ذکر کی ہے۔اور اس کی تخصیص کی روایت ابو داؤد کتاب الحدود سے تحریر کی ہے) (صفحہ ۴۱)

قطع ید کا حکم تو عام ہے لیکن حدیث نے اس کو یوں کر دیا کہ اس پر رُبع دینار کی قید عائد کر دی۔ یہ تخصیص لفظ ’’سارق‘‘ کے صحیح مفہوم کی جو آیت میں مراد ہے وضاحت ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر عموم کے لئے کچھ فطری قیدیں اور تخصیصات ہوتی ہیں ،جو عموم کی مقترن اور ہمزاد ہوتی ہیں۔ مثلاً آیت توریث اپنے حکم میں عام ہے۔ (سورہ النساء آیت ۱۱)(صفحہ۴۲)

عموم کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر باپ اپنے بیٹے کا اور ہر بیٹا اپنے باپ کا وارث ہو لیکن اس کے اندر یہ تخصیص مضمر ہے کہ اختلاف دین کی صورت میں یہ عموم باقی نہیں رہے گا، اس مضمر حقیقت کو نبی ﷺ نے یوں کھول دیا:

''لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم''
(صحیح بخاری، کتاب الفرائض)(صفحہ۴۴)

یہی صورت چوری پر قطع ید کے حکم کے عموم کی ہے۔۔۔ لیکن اس عموم کے اندر یہ مضمر ہے کہ چور عاقل و بالغ ہو ۔۔۔یہ ساری باتیں اس عموم کے اندر روز اول سے مضمر ہیں جن کو روایت اور فقہا کے اجتہادات سے واضح کر دیا۔ (صفحہ۴۵)

تحدید و تخصیص القرآن بالسنة کا جائزہ

موصوف نے زیر نظر عنوان میں تحدید و تخصیص القرآن بالسنہ کے سلسلے میں کچھ محدودات و مخصوصات کو نسخ کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ ان کا یہ بلادلیل انداز ہے اور کسی بھی ''امام حدیث کی مستند کتاب'' سے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ گویا اس طرح مولانا نے مسائل شریعت کو اور اس کے ماخذ و مصدر (قرآن و سنت) کو گھر کی لونڈی بنالیا ہے ،جس پر وہ اپنے خود ساختہ اصولوں کی مشق ستم جاری رکھتے ہیں ، اور بسا اوقات مخصصات کو نسخ القرآن بالسنہ کا غیر شرعی سر ٹیکفیٹ دے کر اس کے منکر ہو جاتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔

مولانا شاید ''مزاج شناس'' قرآن ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ،اور ان کے فہم کے مطابق یہ ڈگری خود پیغمبر ﷺ کو بھی حاصل نہیں تھی۔ نعوذباللہ من ذالک

جناب کو وہ قرائن و مضمرات پیغمبر ﷺ کی تخصیصات و تحدید میں بھی نظر نہیں آئے جو خود کو اپنی عینک سے قرآنی احکام میں دکھائی دے رہے تھے۔ لہٰذا جناب نے سنت کو منزل من اللہ مان کر بھی اسے اپنے ہاتھ ہی میں رکھا کہ بوقت ضرورت خود ساختہ قوانین و قواعد سے اس کی بخیہ گیری کر سکیں اور اس طرح مولانا یہ باور کراتے رہے کہ سنت کے اختیارات کی حد بندی کا ملکہ حقیقتاً مولانا موصوف کے پاس ہی رہا۔ اب اس سے بڑھ کر اور گمراہی و کج فکری کیا ہو سکتی ہے۔ قطع ید و مسئلہ میراث میں تو سنت کی تحدید و تخصیص کو مان لیا اور مسئلہ رجم میں انکار کر دیا آخر کیوں؟

کیا دونوں مسئلے سنت میں نہیں ہیں؟ کیا ایک مسئلے تحدید و تخصیص کا حکم لگا کر مان لینا اور دوسرے کو ناسخ القرآن کا فتوی دے کر اس سے منکر ہو جانا کسی ''امام حدیث کی مستند کتاب''سے ثابت ہے؟

ایک مسئلے میں قرائن و مضمرات کامل جانا اور دوسرے میں اندھے پن کا مظاہرہ کرنا ہی مبادی تدبر حدیث ہے؟ مولانا کی یہ تقسیم بے دلیل ہے اور ان کے منکر سنت و حدیث ہونے کی نشاندہی ہے کہ منکرین حدیث بھی اپنے مقصد کے لئے حدیث کو استعمال کرتے ہیں۔

اگر قرینہ و قیاس اور مضمرات نہیں ہیں تو دونوں پر نہیں اور اگر ہیں تو دونوں

پر ہیں۔ مولانا کا فرق کرنا خود ساختہ قانون و قاعدہ ہے۔ جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

لفظ ‘‘سارق’’ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے کہ نبی ﷺ کی تحدید و تخصیص اس میں مضمر معنی کی وجہ سے تھی ،بلکہ نبی ﷺ خود شارح کتاب اللہ ہیں ،اور آپ کے فرامین از خود حجت و دلیل ہیں۔ اسی سے آپ نے قرآنی آیت میں بیان کردہ حکم کی تخصیص کی ہے۔ اسی طرح مسئلہ وراثت ہے جس کی تحدید و تخصیص کا کوئی قرینہ و مضمرات نہیں ہیں بلکہ صرف پیغمبر ﷺ کا فرمان عالی شان ہے جو‘‘وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی’’ کا مصداق ہے، اور اسی اتھارٹی کو نبی ﷺ نے استعمال کرتے ہوئے ‘‘الزانیة والزانی’’ کو غیر شادی شدہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔

(بحوالہ صحیح بخاری)

اب مولانا نے جانے فرامین پیغمبر (حدیث و سنت) کو کیا مقام دیتے تھے، جو قرائن و مضمرات کا سہارا لے کر بخاری و مسلم جیسی احادیث کا بھی انکار کر بیٹھے۔

مولانا نے باب تو حدیث و سنت سے تخصیص کا قائم کیا ہے اور بحث کرتے ہوئے نہ صرف حدیث و سنت کا فرق بھول گئے بلکہ لکھ دیا کہ ہر عموم کے لئے کچھ فطری قیدیں اور تخصیصات ہوتی ہیں جو عموم کی مقترن و ہمزاد ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ ! اگر عموم کی تخصیص فطرت

سے ہی ہونی تھی تو پھر حدیث و سنت کا عنوان ہی بالکل بے کار ہے، اور حدیث و سنت کی تخصیصات قابل قبول ہیں تو پھر فطری قید کا کوئی فائدہ نہیں کہ حجت تو حدیث ہی ہے۔ مولانا کے جانے بعد قیامت تک ان کے حواری نے تو سارق و قطع ید کی فطری ہمزادومقترن بالعموم قیدیں بیان کر سکتے ہاور نہ ہی مسئلہ توریث کیہ ان شاء اللہ ہ یہ مسئلہ صرف حدیث ہی سے ثابت ہے۔ جو مولانا کو قبول نہیں۔ اب مولانا منکرین حدیث کی صف میں کھڑ دکھائی دیتے ہیں۔ انجام نہ جانے کیا ہوا ہوگا؟

عموم کے مضمرات کو کھولنے کا مولانا نے ایک اور نسخہ بتایا ہے۔ وہ ہے فقہا کا اجتہاد۔ اب نہ جانے وہ خود بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں؟ یہ فیصلہ تو ہم باانصاف قارئین پر چھوڑتے ہیں اور سر دست سوال کرتے ہیں کہ پھر حدیث و سنت کی تخصیصات کا عنوان قائم کرنے کا کیا فائدہ ؟کیا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حدیث و سنت،فطرت اور فقہا کے اجتہادات سب برابر ہیں،‘‘منزل من اللہ ’’ہیں ، واجب الاتباع ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک

دوسری مثال میں مولانا سورہ نور کی ایک آیت میں بحث کرتے ہوئے تخصیص کو نسخ قرار دیتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ‘‘ الزانیة والزانی’’ میں غیر شادی شدہ کا تصور کہا سے حائل ہوتا ہے؟ کوئی قرینہ بھی موجود نہیں؟

تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مولانا اس بحث میں کھل کر اپنے منکر سنت ہونے کا عندیہ دے رہے ہیں اس لئے وہ یہ سوال کر رہے ہیں ،کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسئلہ قطع ید ،مسئلہ توریث میں بھی کوئی قرینہ نہیں ہے مگر مولانا کو وہ تسلیم ہے، کیوں؟

کیا نبیﷺ کا بیان آجانے کے بعد بھی قرینہ لانا ضرور ی ہوتا ہے[1]

تو پھر سنت کا مقام (جو مولانا کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن اسی سے واضح ہوتا ہے اور اس کا انکار قرآن کا انکار ہے) کہاں گیا؟ مولانا کے خود ساختہ قواعد کی بھینٹ چڑھ گیا؟

کیا موصوف اتنے ہی بے علم و نا فہم تھے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ شادی شدہ کا زنا بڑا جرم ہے بنسبت ایک غیر شادی شدہ کے ،کیوں کہ اول الذکر محل قضا شہوة رکھتا ہے جب کہ ثانی الذکر کے ہاں ایسا نہیں۔ مولانا اس(رجم) کو قرآن کا ناسخ گردانتے ہیں۔ واللہ اعلم یہ کیسا استدلال ہے حالانکہ حدیث صرف شادی شدہ زانی کے رجم کا حکم بیان کرتی ہے جب کہ قرآنی حکم جو جلد(کوڑے لگانے پر مشتمل ہے) علی حالہ باقی رہتا ہے۔ فیا للفھم والعقول

آگے جو مولانا نے مخصص و مخصص کی بحث میں شرائط فقہا کی بات کی ہے تو

---

[1](?)بشرطیکہ وہ اصول حدیث کی روشنی میں صحیح طور پر ثابت ہو۔

یہ بھی مولانا کا خود ساختہ قاعدہ ہے جس پر ان کے پاس کسی بھی ''امام حدیث کی مستند کتاب'' سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

ذیل میں ہم ائمہ حدیث و دیگر اہل علم کی تحریروں سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جس میں ائمہ سلف صالحین سے مقام سنت، تحدید و تخصیص قرآنی بذریعہ سنت، حجیت سنت بنفسہ اور تبیین و تشریح سنت للقرآن وغیرہ کا بیان ہوگا، اور اسی کی روشنی میں مولانا امین اصلاحی کے مؤقف کی کمزوری واضح ہوگی ان شاءاللہ۔

(۱)امام خطیب بغدادی :

امام صاحب ''الکفایہ'' میں باب قائم کرتے ہیں کہ'' وجوب عمل اور لزوم تکلیف میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے حکم میں کوئی فرق نہیں''۔ پھر اس عنوان کے تحت احادیث و آثار نقل کرتے ہیں جن میں بسا اوقات قرآنی آیات سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے جو حدیث نقل کی ہے وہ''اوتیت القرآن ومثلہ معہ''والی ہے۔ جس میں گھریلو گدھے اور کچلیوں والے درندوں کی حرمت کا ذکر ہے جو کہ قرآن میں نہیں ہے۔ کچھ آگے چل کر عمر فاروق ؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ رجم(شادی شدہ کے لئے) حق ہے اور یہ حکم کتاب اللہ میں ہے۔ بظاہر یہ بھی قرآن میں نہیں۔ عبداللہ بن مسعود ؓ کاقصہ نقل کیا ہے کہ''ما آتاکم

الرسول فخذوہ’’ سے پیغمبر ﷺ کی ہر بات کا حجت ہونا لازم ہوتا ہے۔

اب مولانا امین احسن صاحب کے ہاں تو ‘‘حدیث عمر’’ نعوذباللہ ‘بیہودہ’ہے۔
(دیکھئے تدبر قرآن سورہ نور کی تفسیر)

گویا مولانا رجم کے منکر ہیں۔ صاحب‘‘الکفایہ’’ کے خلاف ہیں اور ساتھ ہی اپنے مؤقف کے بھی خلاف ہیں لکھتے ہیں رجم قرآن سے ثابت ہے۔
(دیکھئے سورہ نورکی تفسیر از مولانا موصوف)

اور مولانا خوارج کا مؤقف بھی رکھتے ہیں ،لکھتے ہیں کہ خوارج رجم کے منکر تھے۔
(تدبر قرآن)

خطیب بغدادیؒ باب‘‘تخصیص السنن لعموم محکم القرآن وذکر الحاجۃ فی المجمل الی التفسیر والبیان ’’ قائم کرتے ہیں اور اس میں مسئلہ توریث، مسئلہ قطع یدوغیرہ بیان کر کے عنوان کو واضح کرتے ہیں مگر مولانا کی طرح نہ تو فطری قید کی بات کی ہے نہ مضمرات وغیرہ کی اور نہ ہی مخصصات کو نسخ وغیرہ کی تقسیم سے گزرا ہے۔

(۲)امام ابن قیم:

‘‘اعلام الموقعین’’ میں باب قائم کرتے ہیں‘‘تخصیص القرآن بالسنہ جائز’’مسئلہ

توریث (لا یرث المسلم الکافر) مسئلہ قطع
ید وغیرہ بیان کر کے اپنے عنوان کی
وضاحت کرتے ہیں ،عنوان ''بیان الرسول
علی انواع'' کے تحت لکھتے ہیں کہ سنت
زائد علی القرآن بھی ہو سکتی ہے مگر
اسے نسخ نہیں کہا جاتا ہے۔

'السنة مع القرآن علی ثلاثة اوجہ' کے تحت
لکھتے ہیں:

''بل احکام السنة التی لیست فی القرآن لم
تکن اکثر منها لم تنقص عنها فلو ساغ لنا رد
کل سنة زائدة کانت علی نص القرآن لبطلت
سنن رسول اللہ کلها الاسنة دل علیها القرآن
وهذا هو الذی اخبر النبی بانہ سیقع ولا بد
من وقوع خبرہ''

ترجمہ:''وہ احکام سنت جو قرآن مجید میں
نہیں وہ اگر قرآن مجید سے زیادہ نہیں تو
کچھ کم بھی نہیں ہیں۔ اگر ہمارے لئے ہر
اس سنت کو جو زائد علی القرآن ہے رد کر
دینا جائز ہوتا تو (تقریباً) تمام سنتیں ہی
ختم ہو جاتیں ۔سوائے إن سنتوں کے جو
قرآن سے ثابت ہوتیں اور یہ تو وہی (رد
سنت کا عمل) ہے جس کے واقع ہونے کی
خبر نبی مکرم نے دی تھی سو یہ واقع ہو
چکا ہے''

'زیادة السنة علی القرآن وحکمها' کے تحت
لکھتے ہیں:

''ولو کان کل ماأو جبتہ السنة ولم یوجبہ
القرآن نسخالہ لبطلت اکثر سنن رسول
اللہ ودفع فی صدورها واعجازها ۔۔۔قال
رسول اللہ انی قد خلفت فیکم شیئین
لن تضلوا بعدهما کتاب اللہ وسنتی ولن
یتفرقا حتی یرد اعلی الحوض فلا یجوز

التفریق بین ما جمع اللہ بینهما ویرد احدهما بالآخر'' (اعلام)

ترجمہ: ''اگر یہ مان لیا جائے کہ جو چیز حدیث سے واجب اور قرآن سے واجب نہیں وہ قرآن کی ناسخ ہے۔ تو اکثر سنتیں باطل ہوجائیں گی اور سر پیر سے اکھڑ جائیں گی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں میں تم میں دو چیزیں اپنے بعد چھوڑ کر چلا ہوں ان دونوں کے ہوتے ہوئے تم گمراہ نہ بنو گے، اور یہ دونوں جدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر آئیں گی، کتاب اللہ اور میری سنت پس جن دو چیزوں کو اللہ نے جمع کیا ہے۔ ان میں جدائی حرام ہے۔ ایک سے دوسری کو رد کرنا بھی حرام ہے۔،''

(۳)امام شافعی:

امام شافعی ؒ اپنی کتاب ''الرسالة'' میں باب قائم کرتے ہیں ''ما نزل عاما دلت السنة خاصة علی أنہ یراد بہ الخاص'' اور اس عنوان کی توضیح کرتے ہوئے مسئلہ توریث، مسئلہ قطع ید وغیرہ کی مثال دے کر ثابت کرتے ہیں کہ سنت قرآنی احکام کی تحدید وتخصیص کرتی ہے۔ پھر ''الزانیة والزانی'' والی آیت لکھ کر لکھتے ہیں کہ:

''فلما رجم رسول اللہ الثیب من الزناة ولم یجلدہ: دلت سنة رسول اللہ علی ان المراد بجلد المائة من الزناة: الحران البکران''

ترجمہ: ''پس جب رسول اللہ ﷺ نے شادی شدہ زانی کو بلا جلد (کوڑے) کے رجم کیا تو

ثابت ہوا کہ سو(۱۰۰) کوڑے کی سزا مارے جانے والے زانی آزاد و کنوارے ہیں نہ کہ شادی شدہ’’

اب مولانا موصوف کی طرح امام شافعی ؒ کو یہ حدیث ناسخ القرآن دکھائی دی اور نہ ہی اسے انہوں نے فطری قید و مضمرات کی خود ساختہ کسوٹی سے گزارا۔

امام شافعی ؒ جسے تحدید و تخصیص سمجھتے ہیں موصوف اسے ناسخ قرآن سمجھ بیٹھے ہیں جو کہ موصوف کے منفرد فی الاصول ہونے کی دلیل ہے۔

امام شافعی ؒ کے نزدیک فرائض منصوصہ کے ساتھ بھی رسول اللہ ﷺ کی سنت لگی ہوئی ہے جس کی مثال وضو اور غسل وغیرہ کا طریقہ ہے۔

مولانا موصوف کے ہاں تو قرآن ہی کسوٹی و اساس سنت ہے جب کہ امام شافعی کے ہاں سنت کو یہ مقام حاصل ہے کہ قرآن سنت (ثابت صحیحہ)کو منسوخ بھی نہیں کر سکتا۔ (دیکھئے الرسالۃ)

(۴)امام ابن عبدالبر:

امام ابن عبدالبر ؒ ‘‘جامع بیان العلم وفضلہ’’ میں باب قائم کرتے ہیں کہ‘‘موضع السنۃ من الکتاب وبیانھا لہ’’ اور اس میں بڑی تفصیل سے حجیت سنت بنفسہ مقام سنت و اہمیت سنت پر گفتگو فرماتے ہیں، فتنہ انکار حدیث کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے حدیث لکھتے ہیں:

‘‘یوشک باحدکم یقول ھذا کتاب اللہ ما

كان فيه حلال احللناه وما كان فيه حرام حرمناه ،ا لا من بلغه عنى حديث فكذب به فقد كذب الله ورسوله والذى حدثه’’

ترجمہ:‘‘یعنی عنقریب تم اپنے ہی میں سے کسی کو یہ کہتے سنو گے کہ یہ کتاب اللہ ہی کافی ہے جو اس میں حلال ہے وہی حلال جاننا اور جو اس میں حرام ہو اسے ہی حرام جاننا ہےخبردار ہو جاؤ!جس کسی کو مجھ سے حدیث پہنچے اور وہ اسے جھٹلا دے تو گویا اس نے اللہ، رسول اللہ اور راوی حدیث (تینوں کو) جھٹلادیا’’

اور پھر اثنائے گفتگو ایسے آثار نقل کرتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ خیرالقرون میں قرآن و سنت میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا نہ سنت کے لئے قرآن کو اساس بنایا جاتا تھا ہمزید لکھتے ہیں سنت میں قرآن کے احکام کا بیان دو طریقوں سے ہوتا ہے۔(۱)کتاب کے اجمالی احکام کی وضاحت۔(۲)حکم کتاب سے زائد، اور اس (دوسرے) طریقہ کے تحت لکھتے ہیں جیسے:

‘‘تحریم نکاح المراة على عمتها وخالتها وكتحريم الحمر الاهليه وكل ذى ناب من السباع ،الى اشياء يطول ذكرها’’

ترجمہ:‘‘جیسے کہ خالہ یا پھوپھی کی موجودگی میں ان کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح کرنا اور جیسے کہ گھریلو (پالتو) گدھے اور کچلیوں والے درندوں کا حرام ہونا اور ایسی بہت سی اشیاء جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا’’

ان لوگوں پر رد کرتے ہوئے(جو سنت میں قید لگاتے ہیں کہ وہ قرآن کے عین موافق ہو) لکھتے ہیں:

‘‘وقد امرالله عزوجل بطاعته واتباعه امرا

مطلقا مجملاً لم یقید بشئ ولم یقل وما وافق کتاب اللہ کما قال بعض اہل الزیغ''

ترجمہ:''یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ نے مطلقاً نبی کی اطاعت و اتباع کا حکم دیا ہے ،اور اس میں کوئی قید نہیں لگائی اور نہ ہی یہ کہا کہ جس امر میں قرآن مجید کی موافقت ہو (اس میں اتباع کرو) جیسے بعض اہل زیغ و ضلال کہتے ہیں''

اب مولانا اپنے خود ساختہ قواعد تدبر حدیث کی وجہ سے امام ابن عبدالبر کے ہاں ''اہل زیغ'' قرار پاتے ہیں۔

(۵)شیخ مصطفی سباعی:

شیخ مصطفٰی سباعی مرحوم''السنة ومکانتھا'' میں بڑی تفصیل سے حدیث و سنت کے مستقل ماخذ شریعت ہونے پر گفتگو کرتے ہیں اور اس کے دلائل ذکر کرتے ہیں۔فلیراجع

تمام گفتگو تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا امین احسن اپنے خود ساختہ قواعد (کہ سنت کی اساس قرآن ہے، سنت کی تخصیص کو نسخ قرآن قرار دینا ، اور پھر اس سلسلے میں سنت کو فطری قید و مضمرات اور قرائن سے گزارنا) ان سب میں ہی منفرد ہیں، کوئی بھی امام حدیث ان کے ساتھ نہیں اور نہ ہی کسی''امام حدیث کی مستند کتاب'' سے ان کے پاس کوئی دلیل ہے۔ نتیجتاً ان کی کتاب ''مبادی تدبر حدیث'' صرف اپنے خود ساختہ نظریات ہی کا پلندہ ہے، اور ''تمسخر حدیث '' کی راہ دکھاتی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

امام سیوطی ؒ ایسے منکر حدیث پر حکم لگاتے ہیں کہ جس نے معروف اصولوں سے مشروط(ثابت شدہ) قولی یا فعلی حدیث کی حجیت کا انکار کیا وہ کافر ہے، اسلام سے خارج ہے، اور اس کا حشر یہود و نصاریٰ یا دیگر کفار کے ساتھ ہوگا۔ ان شاء اللہ (مفتاح الجنة)

اصول اصلاحی:

تدبر حدیث کے چند بنیادی اصول

لکھتے ہیں :’’علم رسول کے اس عظیم سرمایہ سے جو احادیث کی شکل میں امت کو منتقل ہوا حقیقی معنوں میں فیض یاب ہونے کے لئے تدبر حدیث ضروری ہے۔یہ رہنما اصول پانچ ہیں:

قرآن مجید ہی امتیاز کی کسوٹی ہے۔ حدیث کے معاملے میں بھی اصلاً وہی امتیاز کی کسوٹی ہے۔ (صفحہ ۴۷)

قرآن میزان عدل ہے۔ دین و شریعت کی ہر چیز کو قرآن مجید کی ترازو میں تولنا اور اس کسوٹی پر پرکھنا ہوگا ،یہ ایک عام کلیہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی حدیث کے باب میں بھی تردد ہوگا تو وہ بھی اسی ترازو میں تولی جائے گی۔

اگر کوئی حدیث کو قرآن کی کسوٹی سے بالاتر خیال کر کے اس کو بجائے خود

میزان قرار دے بیٹھے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تعلیمات قرآن کے صریحاً خلاف روایات کو بھی دین سمجھ کر اختیار کر لے گا، اور اس طرح اس چیز کو بھی دین بنا دے گا جو دین نہیں ہے۔

قرآن کی کسوٹی پر پوری نہ اترنے والی ہر روایت یا تو موضوع ہے یا ہم تک صحیح حالت میں منتقل نہیں ہوئی۔

چنانچہ اس اصول پر اہل فن کا اتفاق رہا ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو گی وہ منکر ہے۔ (صفحہ ۴۹)

امام احمد ؒ کا قول ہے ۔۔۔۔‘‘السنة تفسر الكتاب وتعرف الكتاب وتبينه’’ (الکفایہ)

یہ سوال ہی بالکل خارج از بحث ہے کہ کوئی حدیث قرآن کی ناسخ ہو۔ (صفحہ۵۰)

تدبر حدیث کے مذکورہ بالا اصول کا تجزیہ

یہاں مولانا نے وضاحت نہیں کی کہ‘‘حدیث’’ سنت کے مترادف ہے یا ان میں پھر سے ‘‘زمین و آسمان’’ کا فرق لوٹ آیا ہے؟

اگر دونوں ایک ہی معنی میں ہے تو مولانا کے مؤقف میں واضح تضاد و انتشار ہے کیوں جب وہ یہ لکھ چکے کہ‘‘قرآن سنت ہی سے واضح ہوتا ہے’’ اور سنت کا انکار قرآن ہی کا انکار کے مترادف ہے(مفہوماً)تو پھر سنت کے لئے قرآن کو کسوٹی قرار دینا

کیا معنی رکھتا ہے؟ سنت کی کیا حیثیت مولانا نے متعین کی؟ سنت قرآن کی اساس و کسوٹی اور قرآن سنت و حدیث کی کسوٹی؟ مولانا کے دونوں مؤقف میں عمل کس پر ہوگا؟زیر نظر مؤقف کی دلیل کسی‘‘امام حدیث کی مستند کتاب سے کیا ہے؟

حدیث کو قرآن کی کسوٹی سے بالا تر سمجھنا اور بنفسہ اسے میزان سمجھنا موصوف کے نزدیک لا دین کو دین بنانا ہے گویا موصوف حدیث کی بنفسہ حجیت کو تسلیم نہیں کرتے اور منکرین حدیث کے ہمنوا ہیں تو پھر(بقول ان کے) ‘‘بلاسنت و حدیث’’ قرآن کے ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

موضوع روایت کا معیار یہ مقرر کرنا کہ جو بھی قرآن کی کسوٹی پر پوری نہ اترے۔۔۔۔ یہ بھی موصوف کا بلا دلیل دعویٰ ہے ،اور ائمہ حدیث کے مؤقف کی خود ساختہ ترجمانی ہے اور بس ۔۔۔۔ ان کے پاس ‘‘موضوع حدیث’’ کی اس تعریف پر کوئی دلیل کسی بھی‘‘امام حدیث کی مستند کتاب ’’ سے نہیں ہے۔

موصوف کا‘‘حدیث موضوع’’ کی بحث کرتے کرتے اسے منکر قرار دے دینا بھی ان کے مبلغ علم کی نشاندہی ہے ۔امام سیوطی ؒ نے موضوع اور منکر کی الگ الگ بحث کی ہے جو کہ نفی ہے اس بات کی کہ دونوں باہم مترادف المعنی ہیں ۔ (دیکھئے تدریب الراوی)

گویا موصوف پھر منفرد ہو گئے اور یہ

انہیں گوارا نہیں۔

امام احمد ؒ کا قول دوبارہ نقل کرنا اور پھر ناسخ منسوخ کی بحث کرنا عجیب منطق ہے کہ اس قول میں حدیث کا ذکر نہیں بلکہ سنت کا ذکر ہے اور موصوف کے ہاں دونوں میں ’’زمین و آسمان‘‘ کا فرق ہے ، لہٰذا یہ قول ان کی دلیل کیسے بنا؟

اس میں ایسی کوئی بات نہیں کہ جو حدیث قرآن کے خلاف دکھائی دے وہ موضوع یا منکر ہوگی تو پھر مولانا کے استدلال کی اساس یہ قول کیسے ہوگا؟

اس قول میں حدیث کے پرکھنے کے لئے صرف قرآن ہی کو کسوٹی قرار نہیں دیا گیا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مولانا ایک مرتبہ پھر اپنے مؤقف ھذا میں منفرد ہوگئے ہیں اور زبردستی امام احمد ؒ سے اپنا باطل مؤقف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

موصوف کے حلقہ فکر سے سوال ہے کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو گی اس کو تسلیم کرنے کا فائدہ کیا؟ کیا اس کے عوض میں قرآن ہی کافی نہیں؟ قرآن کو اپنی تائید کے لئے کسی حدیث یا روایت کی ضرورت بھی کیا ہے؟

جو روایت قرآن کی آیات کی ترتیب بتاتی ہے اور اس کی محفوظیت کو ثابت کرتی ہے۔ آپ انہیں کس قاعدہ کی رو سے درست سمجھتے ہیں؟ مثلاً یہ کہ نمازوں کی تعداد ہر دن میں پانچ ہے، یہ حدیث قرآن کی کونسی

آیت کے مطابق ہے۔

قرآن تو حروف و الفاظ کا مجموعہ ہے جب تک اس کا کوئی مفہوم متعین نہ کیا جائے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں حدیث قرآن کے مطابق ہے یا نہیں؟ اب ظاہر ہے مولانا کا مفہوم قرآنی ہی صحیح تصور کیا جائے گا جو بدلتا رہتا ہے ،تو اس کے مطابق کبھی حدیث صحیح ہو کر حجت قرار پاتی ہے اور کبھی غیر صحیح ہو کر منکر و موضوع قرار پاتی ہے۔ اگر قرآن ہی کی آیت دوسری آیت کے مخالف یا معارض ہو تو کیا ہوگا؟ مثلاً:

‘‘ک ک ڬ گ ڳ’’

‘‘آپ اپنی محبوب ہستیوں کو ہدایت نہیں دے سکتے’’

‘‘ٹ ڤ ڤ ڦ ڨ’’

‘‘آپ ہی صراط مستقیم کی ہدایت کرتے ہیں؟’’

اصول اصلاحی:

ہر حدیث، احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جزو ہے

‘‘دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر حدیث احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جزو سمجھی جائے گی۔ اگر کوئی حدیث اپنے مجموعی نظام سے بے جوڑ ہوگی تو وہ رد کر دی جائے گی۔’’ (صفحہ۵۰)

اصول اصلاحی کا تجزیہ:

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا

مذکورہ ‘‘اصول’’ بالکل صحیح ہے۔ مگر دلیل کسی‘‘امام کی مستند کتاب’’ سے مفقود ہے۔ لٰذا موصوف پھر منفرد دکھائی دیتے ہیں۔

ممکن ہے کم علمی کی وجہ سے کوئی حدیث صحیح مجموعہ حدیث کے خلاف و معارض دکھائی دے اور جب کسی امام حدیث کے سامنے رکھی جائے تو وہ اس میں تطبیق و توفیق سے جمع یا ترجیح کی کوئی سبیل بتادے۔

امام سیوطی ؒ نے لکھا ہے کہ اگر امکان جمع ہو تو صرف معارضہ کی بنیاد پر حدیث کو موضوع قرار نہیں دیا جائے گا۔
(تدریب)

لٰذا مولانا کا ہر ایرے غیرے کو احادیث پر حکم لگانے کا اختیار دینا سراسر غلط ہے۔امہات کتب احادیث میں، منگھڑت و مخالف روایات کا گھس آنا شاید صرف مولانا اور ان کے حواریوں ہی کو نظر آیا ہے اس سے قبل تو تمام ‘‘ائمہ حدیث’’ بے چارے اس نگاہ و بصیرت سے محروم ہی رہے۔ (معاذ اللہ)

مگر حقیقت یہ ہے کہ موصوف اس مؤقف میں بھی بالکل منفرد و بلادلیل ہیں ،اور غیر سبیل المومنین کے اندھیرے راستے پر گامزن ہیں جس کا انجام بڑا خطرناک ہے۔

شاہ ولی اللہ ؒ نے بخاری و مسلم جیسی امہات کتب کے بارے میں لکھا ہے کہ جو ان کی شان گھٹائے وہ بدعتی ہے اور غیر سبیل المومنین پر گامزن ہے۔

(حجة اللہ البالغہ)

اصول اصلاحی:

حدیث کی اصل زبان عربی ہے

موصوف لکھتے ہیں: ‘‘اگرچہ احادیث کی روایت، قرآن کے برعکس بیشتر بالمعنی ہوئی ہے تاہم صحیح احادیث کی زبان کا ایک خاص معیار ہے جو بہت اعلیٰ ہے۔۔۔۔ حدیث کی لغوی و نحوی مشکلات کا حل میں ان فنون کے ماہرین ہی کی آرا معتبر سمجھی جائیں گی۔۔۔۔ (صفحہ ۵۱)

حدیث کے طالب علم کے لئے نہ صرف عہد نبوت و صحابہ کی زبان کی مہارت ضروری ہے۔۔۔۔ اگر یہ چیز کسی کو حاصل نہ ہوگی تو اندیشہ ہے کہ وہ الشیخ الشیخة۔۔۔ الخ کو قرآن کی ایک آیت باور کر لے گا حالانکہ قرآن کی آیت تو درکنار اس کو ایک صاحب ذوق کے لئے حدیث ماننا بھی مشکل ہے اس کی زبان بالکل عجمی فقہا کی زبان ہے۔۔ (صفحہ ۵۲)

تجزیہ:

موصوف کا بیشتر احادیث کو روایت بالمعنی قرار دینا بھی بلا دلیل ہے جس پر ان کے پاس کسی بھی ‘‘امام حدیث کی مستند کتاب’’ سے کوئی حوالہ نہیں ہے جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ روایت حدیث میں روایت باللفظ کا اہتمام ہی اصل ہے اور

اس کی مکمل پاسداری ائمہ سلف صالحین اپنے اپنے دور میں کرتے رہے ہیں جب کہ روایت بالمعنی فقط جواز کی ایک صورت ہے اور وہ بھی ماہرین فن حدیث کے لئے سب کے لئے نہیں۔ تفصیل کے لئے اس فن کی امہات کتب کی طرف رجوع کریں۔

یقیناً احادیث کی زبان تو عربی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موصوف اور ان کے حواری جو عجمی النسل ہیں وہ حدیث کی فصیح عربی کو کیسے سمجھیں گے؟ جب کہ حال یہ ہے کہ موصوف اپنی عربی دانی کو حدیث کی عربیت پر فوقیت ‘‘بلا دلیل’’ دیتے ہیں اور پھر منفرد دکھائی دیتے ہیں۔

لغوی نحوی مشکلات میں یقیناً ‘‘ماہر فنون ہذا’’ لوگوں کی آرا معتبر ہوں گی مگر شاید موصوف کو ائمہ حدیث کی عربی دانی کی مہارت کا اندازہ نہیں مولانا کی پسندیدہ کتاب ‘‘الکفایہ’’ میں لکھا ہے۔

‘‘باب اتباع المحدث علی لفظ وان خالف اللغة الفصیحة’’

‘‘اس بات کا بیان کہ محدث کے بیان کردہ الفاظ کی اتباع ہوگی اگرچہ وہ فصیح لغت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو’’۔

اور ابو عبیدہ کا یہ قل اس باب کے تحت نقل ہوا ہے کہ:

‘‘لاھل الحدیث لغة ولا ھل العربیة لغة ولغة اھل العربیة اقیس ولا تجد بدا من اتباع اھل الحدیث من اجل السماع’’

‘‘یعنی اہلحدیث اور اہل عرب کی اپنی اپنی لغت ہیں ،اور اہل عرب کی لغت زیادہ صحیح ہے ،لیکن اہل حدیث کی لغت کی اتباع کے بغیر چارہ کار نہیں ان کے سماع کی وجہ’’

نیز حدیث رسول اللہ ﷺ ‘‘لیس من امبر امصیام فی امسفر’’ نقل کی ہے۔ اب بتائیں موصوف کے حواری لغة المحدثین کو ترجیح دیں گے یا اپنی (عجمی) لغت کو؟ جسے وہ بزعم خویش فصیح گردانتے ہیں ۔

موصوف کا حدیث صحیح بخاری ‘‘الشیخ والشیخة’’کو عجمی فقہا کی زبان کہہ کر قابل رد قرار دینا انتہائی جسارت ہے اور اپنے منکر حدیث ہونے کی وضاحت ہے،کیوں کہ یہ حدیث امہات الکتب کے ساتھ ساتھ صاحب کفایہ کی ‘‘الکفایہ’’ میں بھی موجود ہے۔ گویا موصوف اپنی عربی دانی میں تمام ائمہ حدیث سے آگے بڑھ گئے اور ایک بار پھر منفرد ہو گئے ہیں۔

کیا موصوف کو لفظ الشیخ والشیخة پر اعتراض ہے کیوں؟ کیا یہ عربی کے خلاف ہے؟ نہیں بلکہ موصوف کو اپنی خود ساختہ عربی میں یہ لفظ نہیں ملا وگرنہ تو ہر امام حدیث کو یہ لفظ ملا ،انہوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا اور کبھی بھی اسے عجمی فقہا کی زبان قرار نہیں دیا۔ کیوں کہ لفظ ‘‘الشیخ’’ قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور اس کی مؤنث ‘‘الشیخة’’ہی آتی ہے ،جیسا کہ لسان العرب اور صاحب مصباح اللغات نے لکھا

ہے۔

موصوف کے جس طرح ‘‘مبادی تدبر حدیث ’’اپنے خود ساختہ ہیں بالکل اسی طرح عربی لغت بھی ان کی اپنی ہی ہے جو ان کے عجمی بطن و فم سے نکلی ہے اور ایسی نکلی ہے کہ اس نے قرآن ،حدیث ،ائمہ حدیث و لغت میں سب کی عربی کو یک لخت پراگندہ کر کے غلط قرار دے دیا ہے۔اعاذنا اللہ منہ

محدثین نے جو رکاکت (کمزوری) الفاظ کا ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث کے ضعیف یا موضوع ہونے کی ایک علامت ہے تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ:

ابن حجر ؒ فرماتے ہیں‘‘رکاکت کا تعلق صرف معنی سے ہے ’’اور اسی کو وضع حدیث کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں رکاکت موجود نہ ہو۔ اور اگر صرف الفاظ ہی میں رکاکت موجود ہو تو مجرد اس کو وضع حدیث کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا ممکن ہے راوی نے بالمعنی روایت کی ہو اور فصیح الفاظ کو غیر فصیح میں تبدیل کر دیا ہو۔ (تدریب)

بہر حال ہم لکھ چکے ہیں کہ لفظ‘‘الشیخ والشیخۃ’’ کسی بھی طرح غیر فصیح نہیں ہے۔ بلکہ قرآن ،حدیث اور لغت میں مستعمل ہے۔

اصول اصلاحی:

کلام کے عموم و خصوص ،موقع و محل اور خطاب کا فہم ضروری ہے

''الا ئمة من قریش'' (خلفاء قـریش میں سے ہوں گے)۔۔۔۔اس کے موقع و محل کو سمجھنے میں صدر اول کے بعد کے دور کے بیشتر اصحاب علم نے شدید غلطی کی ہے۔ (صفحہ۵۳)

بعض حدیثوں میں آتا ہے ''امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا الا الہ الا اللہ'' اس کو ظاہری معنی میں لیں اور صحیح موقع و محل نہ سمجھیں تو مستشرقین کا کہنا صحیح ثابت ہو جائے گا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔۔۔۔

اگر آپ حدیث کے لفظ ''الناس'' کے عموم کو بنی اسماعیل کے لئے خاص مان لیں جس کا واضح قرینہ موجود ہے تو حدیث قرآن مجید کے بالکل مطابق ہو جاتی ہے۔۔۔۔ (صفحہ۵۴)

تجزیہ:

موصوف کے ہاں چوتھااصول زیر نظر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اصول کسی''امام حدیث کی مستند کتاب '' سے ماخوذ ہے؟ یا صرف موصوف کے اپنے خیالات کی ترجمانی ہے(قطع نظر اس بات سے کہ یہ صحیح ہے یا غیر صحیح)

یقیناً موقع و محل اور عموم و خصوص کا فہم ضروری ہے مگر ایسا بھی فہم کیا

کہ چودہ سو سال میں آج صرف موصوف کو نظر آیا اور یہ بھی خوب کہ اب عموم و خصوص بھی بلا فطری قید و مضمرات صرف قرائن سے ہی سمجھ آنے لگے ہیں اور وہ بھی صرف اور صرف موصوف کو،آخر کیوں؟کیا تمام ائمہ حدیث اس قدر فہم و فراست سے عاری تھے کہ‘‘الائمة من قریش’’والی حدیث کا معنی بھی متعین نہ کر سکے۔

یہ عجیب منطق ہے کہ جب کسی مؤقف کی دلیل نہ مل سکے تو جناب ‘‘الکفایہ’’ کو بھول بھال کر لکھ دیتے ہیں کہ اس مسئلہ میں بیشتر اصحاب علم نے شدید غلطی کی ہے(اور موصوف شاید غلطیوں سے مبرا ہیں)

حقیقت یہ ہے کہ حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے ،اور ائمہ سلف صالحین نے اس سے جو کچھ سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے اسی لئے موصوف کے پاس اپنے اس مؤقف میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہمارا موصوف کے حواریوں کو مشورہ ہے کہ وہ اس حدیث کے معنی متعین کر کے ماننے کے در پر نہ ہوں بلکہ بالکل سیدھا سیدھا قرآن کے خلاف کہہ کر اسے ماننے سے انکار کر دیں کہ قرآن میں صرف ‘‘ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم’’ ہی کی شرط ہے اور باقی کوئی نہیں، کیا خیال ہے؟ کیا یہ قرآن کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے؟

دوسری حدیث کو بھی موصوف نے اپنے خود ساختہ اصول ‘‘قرآن کی کسوٹی کے

مطابق بنانے کی کوشش کی ہے گویا اس سے قبل یہ حدیث قرآن کے خلاف تھی؟ مگر موصوف نے اس آیت کا حوالہ نہیں دیا، جس کی مخالفت میں یہ حدیث ہے؟

اس کا سیدھا سا معنی تو یہ بنا کہ اگر موصوف کا خود ساختہ معنی کسی حدیث کا نہ لیا جائے تو وہ خلاف قرآن ہو جاتی ہے۔ استغفراللہ ۔

اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ معنی نہیں لیں گے تو اسلام کا تلوار سے پھیلانا لازم آئے گا۔ سبحان اللہ کیا فہم ہے جناب کا، اچھا تو کیا اسے بنی اسماعیل کے ساتھ خاص کردینے سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ بنو اسماعیل تو تلوار کے زور اور ڈرسے مسلمان ہوئے تھے؟ کیا اس میں قرآن کی مخالفت نہیں ہوگی؟

اب مستشرقین کے اعتراض کیا جواب ہوگا؟ آپ کے قرینے و قرآن کو تو وہ مانتے ہی نہیں۔

اصول اصلاحی:

دین اور عقل و فطرت میں منافات نہیں ہے

پانچویں اور آخری اصول کے تحت لکھتے ہیں ہر وہ چیز جو عقل و فطرت کے منافی ہو گی وہ دین کے بھی منافی ہوگی۔

حدیث کے دل میں اترنے کا اصلی راستہ بھی عقل و فطرت ہی ہے۔ اگر کوئی بات صریحاً عقل کے منافی نظر آئے تو اس

پر اچھی طرح غور کیجئے یہاں تک کہ یا تو اپنی غلطی واضح ہو جائے یا حدیث کا ضعف سمجھ میں آجائے۔ (صفحہ۵۵)

اگر یہ بات عیاں ہو جائے کہ اس(حدیث)میں اور عقل و فطرت میں منافات پائی جاتی ہے اور غوروفکر کے باوجود کسی طرح اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی تو یہ رد کرنے کے قابل ہے۔

کسی روایت کو ضمنی طور پر حدیث رسول قرار دینا بڑی بھاری ذمہ داری کا کام ہے ہر شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ (صفحہ۵۶)

تجزیہ:

مولانا کی اجمالی بات میں رطب و یابس پایا جاتا ہے ۔تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ یقیناً دین اسلام فطرت و عقل سلیم کے مطابق ہی ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ حدیث کے قبول و رد میں اسی کو معیار قرار دے دیا جائے۔ کیوں کہ اسلام تو عقل و فطرت کے خلاف نہیں مگر لوگوں کی عقل تو اسلامی احکام کے خلاف ہو سکتی ہے جس کا مشاہدہ آئے روز ہو تا ہی رہتا ہے۔

عقل و فطرت کو ایک قرار دے کر مولانا نے لکھا ہے جو اس کے خلاف ہو وہ دین کے بھی خلاف ہے۔

حالانکہ اس قول میں یہ غلط اور مسموم عقیدہ بالکل واضح ہے کہ عقل و فطرت ہی دین ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے گی، کتنا خطرناک عقیدہ و نظریہ ہے۔

نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک چیز موصوف کے ہاں ازروئے عقل دین ہے مگر ائمہ محدثین کے ہاں شاید نہ ہو جب کہ اسی طرح ایک چیز موصوف کی عقل کے مطابق دین کا درجہ نہ پا سکے مگر ائمہ محدثین کے ہاں اور اجماع امت میں اسے دین کا درجہ حاصل ہو(کیوں کہ قبولیت کے اصولوں کے عین مطابق ہے)

مولانا کو یوں لکھنا تھا کہ جو دین کے منافی ہے وہ چیز عقل و فطرت کے بھی منافی ہے ،کیوں کہ مسلمانوں کے ہاں بہر حال دین مقدم ہے نہ کہ عقل(موصوف کی ہم بات نہیں کرتے)۔

حدیث[1] کے دل میں اترنے کا اصل راستہ عقل و فطرت کو قرار دینا بھی بے دلیل مؤقف ہے۔

اور یہ بھی خوب کہ اتنا غوروفکر کرو کہ اپنی غلطی سمجھ آجائے یا حدیث کا ضعف سبحان اللہ !کیا بات ہے جناب کی ،اگر یہی معیار ہے احادیث کو پرکھنے کا تو پھر قرآن بھی ضعیف دکھائی دے گا۔گویا عقل و فطرت ہی آخری پیمانہ ہے رد و قبول کا نہ کہ کسی امام حدیث کا مستند قول۔ اس مؤقف میں بھی موصوف منفرد نظر آرہے ہیں۔

عقل کو کلی اختیارات دے کر پھر یہ کہنا کہ کسی روایت کو حدیث رسول قرار دینا بڑا بھاری کام ہے ،ہر شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر کسی

(?)[1] حائضہ عورت صلاۃ و صیام دونوں ترک کرتی ہے مگر قضا صرف روزوں کی دیتی ہے کیوں؟ کیا یہ عقل میں آتا ہے

روایت کو حدیث رسول قرار دینا بڑابھاری کام ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی حدیث رسول کو حدیث رسول سے خارج کرنا بھی بڑا بھاری کام ہے۔ اور ہر شخص اس کا اہل نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً جو عجمی بھی ہو مولانا کی طرح۔

جو لوگ عقل کو اپنی خواہشات کی لونڈی بنانا چاہتے ہیں ان کو اللہ کے حوالہ کیجئے۔

قارئین کرام !یہاں تک بحث میں آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ مولانا موصوف اپنے کسی بھی مؤقف میں نہ تو اصل ‘‘کسوٹی قرآن’’سے کوئی دلیل لا سکے اور نہ ہی ائمہ سلف صالحین و ائمہ حدیث کی کسی مستند کتاب سے کوئی بات نقل کر سکے۔ مگر وہ پھر بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی کتاب ‘‘ائمہ حدیث کی مستند کتب’’ سے ماخوذ ہے، اور میں ان اصولوں کے بیان کرنے میں منفرد نہیں ہوں۔

اب اسے دیوانے کی بڑ کے سوا اور کیا کہئے یہ فیصلہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

اصول اصلاحی:

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لئے اساسی کسوٹیاں

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے

لئے ہمارے نزدیک چھ بنیادی اصول ہیں۔

یہ ایک نہایت حساس موضوع ہے اس لئے ہم اس امر کا اہتمام ضروری خیال کرتے ہیں کہ اپنے مباحث کی بنیاد احادیث رسول اور سلف صالحین کے ارشادات ہی پر رکھیں۔ اپنی جانب سے کوئی بات نہ کہیں۔ (صفحہ ۵۷)

پہلی کسوٹی اہل ایمان و اصحاب معرفت کا ذوق:

کوئی روایت جس کو اہل ایمان اور اصحاب معرفت کا ذوق قبول کرنے سے ابا کرتا ہے وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اس اصول کی طرف خود رسول اللہ ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے:

‘‘اذا سمعتم الحدیث عنی۔۔۔۔۔’’
(الکفایة فی علم الروایة)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی روایت سنو جس سے تمہارے دل آشنائی محسوس کریں تمہارے رونگٹے اور تن بدن اس سے اثر پذیر ہوں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے دلوں سے قریب ہے تو میں تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہوں اور جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی بات سنو جس سے تمہارے دل اجنبیت محسوس کریں تمہارے رونگٹے اور جسم اس سے ناگواری محسوس کریں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے مزاج سے دور ہے تو میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔

(صفحہ ۵۹)

اسی ذیل میں سلف صالحین کے چند اقوال ملاحظہ ہوں :

ربیع بن خثیم نے کہا کہ حدیثوں میں ایسی حدیثیں ہوتی ہیں جن پر روزِ روشن کی تابانی ہوتی ہے، ہم ان کو پہچان لیتے ہیں ،اور حدیثوں میں بعض حدیثیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر شب دیجور کی سیاہی ہوتی ہے، ہمارے قلوب ان کے قبول کرنے سے اباء کرتے ہیں۔ (الکفایہ)

اسی طرح کا قول امام اوزاعی کا اور سیدنا جریر کا بیان کیا ہے کہ وہ احادیث سن کر اپنے احباب و اساتذہ کے سامنے پیش کرتے اور اِن کے کہنے سے ہی اسے قبول کرتے۔ (مفہوماً) (صفحہ ۶۰)

پھر مذکورِبالا اقوال سے چند باتیں نہایت واضح طورِ پر بیان کرتے ہیں۔

ایک یہ کہ کسی حدیث کے قول رسول ہونے کا انحصار اس کی سند سے زیادہ اس کے معنی و مفہوم پر ہے۔ (صفحہ ۶۰)

دوسرے یہ کہ ہر حدیث رسول دل میں ایک اہتزاز پیدا کرتی ہے ، بشرطیکہ دل زندہ ہو۔ (صفحہ ۶۱)

تیسرے یہ کہ نبیﷺ کی زبان کی امتیازی شان ایک صاحب ذوق محسوس کر لیتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ یہ رسول ہی کا کلام ہو سکتا ہے۔ (صفحہ ۶۲)

تجزیہ و تبصرہ:

موصوف کی یہ بات صحیح ہے کہ اہل ایمان و اہل معرفت کے ذوق ہی کو قبول روایت میں ترجیح حاصل ہوگی ،مگر ان کے ذوق کو وہ خود ہی نمایاں کرتے ہیں کوئی اور (عجمی یا خود رائی میں مبتلا) ان کے ذوق عربیہ و معرفت صحیحہ کی حد بندی نہیں کرے گا جیسے کہ موصوف کو عادت ہے کہ بلا دلیل ہی ‘‘الشیخ والشیخة’’ کو عجمی فقہا کی زبان قرار دیتے ہیں، جس ‘‘الکفایہ’’ کا حوالہ موصوف کے ہاں مستند سمجھا جاتا ہے اس میں یہ باب بھی موجود ہے:

‘‘باب فی اتباع المحدث علی لفظہ وان خالف اللغة الفصیحة’’

یعنی قول محدث ہی (روایت میں) قابل اتباع ہوگا اگرچہ (بظاہر) فصیح لغت کے خلاف ہی ہو، موصوف نہ جانے اس سلسلہ میں خطیب بغدادی ؒ پر کیا فتویٰ لگاتے تھے؟

یاد رہنا چاہیئے کہ موصوف نے گزشتہ ساری بحث کو پھر سے ایک نیا نام و انداز دے کر نئے باب میں بیان کیا ہے اگر چہ ہم گزشتہ اوراق میں تفصیلی جوابات دے چکے ہیں ،مگر پھر بھی ہم دوبارہ موصوف کے نئے انداز پر بھی تبصرہ کر رہے ہیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے جواب نہیں دیا گیا۔ واللہ ولی التوفیق

موصوف نے اہل ایمان و اہل ذوق کی

معرفت کی دلیل حدیث رسول سے دی ہے۔ حدیث بالکل صحیح ہے مگر یہ مخصوص اہل فن و معرفت (جو بہت ہی زیادہ حدیث رسول سے وابستہ رہتے ہوں) کے ساتھ خاص ہے ،جس کا اقرار موصوف نے بھی آگے کی سطور میں کیا ہے ،لہذا اسے عام لوگوں (عجمیوں)کے ساتھ نتھی کرنا بالکل غلط ہے۔ ہمارے نزدیک مولانا موصوف کسی بھی اس مقصد کے لئے معیار اور کسوٹی نہیں بن سکتے ،کیوں کہ یہ اپنے ایک خاص ذوق کے مالک ہیں،عجمی فقہا کے قریب ہیں، عجمی النسل ہیں، مزید یہ کہ اپنے ایک مؤقّف پر ثابت قدم نہیں رہتے، موقعہ بموقعہ بدلتے رہتے ہیں جس کی نشاندہی گزشتہ صفحات میں ہو چکی ہے۔

موصوف کا یہ کہنا کہ کسی قول کے حدیث رسول ہونے کا دارو مدار سند سے زیادہ اس کے معنی مفہوم پر ہے۔ سراسر غلط ہے اور خود ساختہ ہے ،کیوں کہ ان کے پاس اس کی کوئی بھی دلیل کسی امام حدیث کی مستند کتاب سے نہیں ہے۔ لہٰذا موصوف اس مسئلے میں سب سے منفرد ہوئے ہیں۔

اس کا معنی گویا یہ ہوا کہ جس روایت یا قول کا مفہوم اور معنی صحیح ہو وہ دین قرار پاجائیگی۔ نعوذ باللہ من ذالک

ہم موصوف کو یاد کروائیں گے کہ پہلے آپ لکھ چکے ہیں کہ کسی روایت کو حدیث رسول قرار دینا بہت بھاری کام ہے۔

ہر شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔

موصوف کے منفرد اصول کے برعکس صحابہ و اتباع صحابہ اور دیگر ائمہ حدیث کے ہاں ہر روایت کی تصحیح و تضعیف سے قبل اس کی سند کو ہی دیکھا جاتا ہے۔

عبداللہ بن مبارک ؒ نے کہا تھا ''الاسناد من الدین لو لا الاسناد لقال من شاء ما شاء'' اسناد دین میں سے ہیں اگر اسناد نہ ہوتیں تو ہر شخص جو چاہتا کہہ ڈالتا۔

سفیان بن عیینہ ؒ نے امام زہری ؒ سے جب بلا سند حدیث کا مطالبہ کیا تو امام زہری نے فرمایا: ''کیا بلا سیڑھی چھت پر چڑھو گے؟'' (تدریب)

سفیان ثوری ؒ نے کہا تھا ''الاسناد سلاح المومن'' اسناد مومن کا ہتھیار ہیں۔ (تدریب)

صحابہ کرام میں بھی سند ہی کا اہتمام زیادہ تھا جس کی دلیل سیدنا ابن عباس ؓ کا وہ قصہ ہے جس میں بشیر عدوی نے انہیں (بلا سند) حدیثیں سنانا شروع کیں تو ابن عباس ان کی طرف بالکل بھی متوجہ نہ ہوئے۔ بشیر نے کہا: میں آپ کو حدیث رسول سناتا ہوں اور آپ توجہ ہی نہیں دیتے۔ تو ابن عباس ؓ نے عرض کی کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص قال رسول اللہ کہتا تو ہم ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سنتے جب ہر کس و ناکس حدیثیں بیان کرنے لگا تو ہم وہی روایت قبول کرنے لگے جس سے آشنا

ہوں۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

نیز امام ابن سیرین ؒ فرماتے ہیں کہ پہلے زمانے میں اسناد سے متعلق نہیں پوچھا جاتا تھا۔ اور جب فتنہ سامانی کا ظہور ہوا تو راویوں کے بارے میں سوال کیا جانے لگا۔ اہل سنت کی روایت کردہ حدیث قبول کی جاتی اور اہل بدعت کی ترک کر دی جاتی تھی۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

لٰہذا موصوف کا قبول روایت میں یا روایت کی حدیث رسول ہونے میں''معنی و مفہوم کو سند سے زیادہ اہمیت دینا تمام اہل ذوق و معرفت حدیث رسول رکھنے والوں کے خلاف ہے۔

اگلے دونوں فقروں میں موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر واقعی اہل ایمان و اہل ذوق و معرفت کے بارے میں ہے تو صحیح ہے اور اگر موصوف کی طرح عجمی لوگ بھی اس میں شامل ہیں تو پھر یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے موصوف کے ہمنوا مولانا مودودی مزاج شناس رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اور اس ضمن میں نہ جانے کتنی حدیثوں کے وہ منکر ہوئے۔ موصوف بھی خود کو مزاج شناس قرآن اور مزاج شناس رسول سمجھ کر نہ جانے کتنی حدیثوں کے منکر ہیں اور دعویٰ یہ کہ ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔

اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا!

اصول اصلاحی:

دوسری کسوٹی ،عمل معروف

اس کی دلیل موصوف نے حدیث سے یہ دی ہے کہ:رسول اللہ ﷺ نے فرمایااگر مجھ سے منسوب کر کے کوئی روایت اس معروف کے مطابق کی جائے جس سے تم آشنا ہو تو اس کو قبول کر لو۔‘‘ (الکفایہ)

وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ معروف سے مراد کتاب اللہ اور سنت رسول ہے اور یہاں منکر کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تمام چیزیں جو ان اصول ، کلیات ، ارشادات اور احکامات کے منافی ہوں جو نبی ﷺ نے دیئے ہیں۔‘‘

عمل معروف کی کسوٹی اگر صحیح طریقے سے مستحضر ہو تو غلط حدیث بھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی آپ صاف سمجھ جائیں گے کہ یہ قرآن کے کلیے کے بالکل خلاف ہے، یہ سنت الٰہی کے خلاف ہے یہ نبی کے عملی تواتر کے خلاف ہے ۔ بنابریں اسے منکرات میں ڈال دینا چاہیے۔ (صفحہ ۶۶،۶۷)

دوسری کسوٹی کا تجزیہ:

موصوف کی دوسری کسوٹی بھی بلا دلیل ہی ہے اگرچہ انہوں نے اس کی اساس ایک روایت سے فراہم کی ہے مگر محدثین کے معیار پر یہ روایت قول رسول قرار ہی نہیں پاتی کہ وہ اسے ’’ضعیف جدا‘‘ کہتے ہیں(یعنی بہت ہی زیادہ

کمزور)۔

(دیکھئے
سلسلہ ضعیفہ
۱۰۹۰)

چونکہ موصوف کو روایات کے لئے سند کی ضرورت نہیں ہے تو اپنے افکار کے لئے وہ سند کیوں فراہم کرنے لگے؟ آگے جو دو باتیں مزید(بطور وضاحت کے) لکھی ہیں تو اس پر ہمارا یہ سوال ہے کہ ''الشیخ والشیخة'' والی روایت کس معروف عمل کے خلاف ہے؟ کن اصولوں، کلیات قرآنی، ارشادات اور احکامات و تواتر عملی کے خلاف ہے؟ اگر خلاف نہیں تو موصوف اس کے منکر کیوں ہیں؟

یہاں غالباً موصوف پھر کہنا چاہتے ہیں کہ سنت کا ماخذ روایات نہیں بلکہ تواتر عملی ہے گویا پھر مؤقف بدل لیا ہے۔(مگر تواتر عملی بھی یہی ہے کہ 'رجم' سنت ہے)۔

اصول اصلاحی:

تیسری کسوٹی قرآن مجید

نبیﷺ کا ارشاد ہے ''سیأتیکم عنی احادیث مختلفة'' عنقریب تمہارے سامنے مجھ سے منسوب ایسی روایتیں آئیں گی جو باہمدگر متناقض ہوں گی تو جو کتاب اللہ اور میری سنت کے موافق ہوں تو وہ مجھ سے ہیں اور جو کتاب اللہ اور میری سنت کے مخالف ہوں وہ مجھ سے نہیں ہیں۔ (الکفایہ)(صفحہ۶۹)

اس میں ہمیں یہ ہدایت دی گئی ہے

کہ کوئی حدیث جو کسی پہلو سے قرآن کے خلاف ہو وہ قبول نہیں کی جائے گی۔

محدثین سے متعلق لکھتے ہیں کہ: بعض غالی اہل حدیث نے حدیث کو قرآن پر حاکم بنانے کی کوشش کی ہے، ان کے اس غلط مسلک کی تردید امام احمد ؒ نے کر دی ہے۔ (مفہوماً) (صفحہ۶۸)

پھر وہی قول امام احمد کا لکھا ہے کہ ‘‘السنة تفسر الکتاب وتعرف الکتاب وتبینہ’’(یعنی سنت کتاب اللہ کی تفسیر ،تعریف اور وضاحت کرتی ہے)

خطیب بغدادی ؒ کے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ان کے خیال میں منافی قرآن روایت قبول نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن ہر چیز کے جانچنے کے لئے محک اور کسوٹی ہے۔ (صفحہ۶۹)

تیسری کسوٹی کا تجزیہ:

موصوف شاید اسی لئے سند حدیث سے زیادہ اس کے معنی و مفہوم پر زور دیتے ہیں تاکہ ضعیف و موضوع روایات کو اپنے حق میں(بوقت ضرورت) استعمال کر سکیں۔ یہاں پر جو روایت موصوف نے لکھی ہے وہ بھی پیمانہ محدثین پر پوری اتر کر صحیح قرار نہیں پاتی بلکہ ضعیف جداً ہے(یعنی بہت زیادہ ضعیف کی ڈگری اسے دی جاتی ہے)

(دیکھئے سلسلہ ضعیفہ ۱۰۶۹)

ہمارے لئے یہ بات بڑی حیرت کا باعث ہے کہ موصوف نے گزشتہ بحث میں قرآن کو پہلی کسوٹی قرار دیا تھا اور یہاں تیسری کسوٹی، شاید ان کے پاس کسی ‘‘امام کی مستند کتاب’’ سے کوئی دلیل ہوگی؟

ہمارا مؤقّف بیان ہو چکا کہ قرآن کے خلاف صحیح حدیث کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے، اور اگر بظاہر ایسا دکھائی دے تو اس فن کے ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کہ وہ اس کی تطبیق و توفیق کے اہل ہیں(قرآن کی کسوٹی پر تفصیلی گفتگو گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے دیکھ لیں)۔

محدثین ؒ کو غالی کہنا بھی شاید موصوف کی انتہائی جسارت ہے۔ اور یہ انداز بھی موصوف کے عجمی النسل ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ اہل ذوق و فن پر ایک بے ذوق و بے اصول شخص فتویٰ لگائے یہ بھی جناب کا ایسا اصول بے اصولی ہے جس کی کوئی دلیل کسی بھی ‘‘امام حدیث کی مستند کتاب’’ میں نہیں ہے۔

باقی رہا کہ سنت کتاب اللہ پر قاضی ہے اس کا تفصیلی جواب فہم سلف صالحین کی روشنی میں گزر چکا ہے، موصوف کا انداز تو ایسا ہے کہ گویا حدیث و سنت میں ‘‘زمین و آسمان’’ کا فرق ہے۔ مگر تردید حدیث کے لئے امام احمد رحمہ اللہ کا وہ قول پیش کرتے ہیں

جس میں لفظ حدیث ہے ہی نہیں،جب وہ لفظ ہی نہیں تو اسے ''غالی اہل حدیثوں'' کے غلط مسلک کی تردید کیسے ہوگئی؟

خطیب بغدادی ؒ کے خیال کی خود ساختہ ترجمانی سے انہیں اپنا ہمنوا اور پیش رو ثابت کرنا بھی مولانا کا واضح دھوکہ ہے۔ کیوں کہ خطیب بغدادی ؒ تو اس بات کے قائل ہیں کہ ''وجوب عمل میں اور لزوم تکلیف میں حکم کتاب اللہ اور حکم سنت رسول اللہ'' میں کوئی فرق نہیں۔ (دیکھئے الکفایہ)

خطیب بغدادی ؒ کا پیش کردہ قولٍ صرف خبر واحد سے متعلق ہے۔ مطلقاً احادیث سے متعلق نہیں۔ لٰذا مولانا کا اس سے مطلقاً احادیث پر استدلا ل بے معنی ہوجاتا ہے۔ اور موصوف پھر منفرد ہو جاتے ہیں۔

اصول اصلاحی:

چوتھی کسوٹی سنت معلومہ

سنن تواتر عملی سے ثابت ہیں، ان پر اخبار آحاد اثر انداز نہیں ہو سکتیں سنن روایات کے بالمقابل قدیم تر ہیں۔

سنت تواتر عملی سے ثابت ہے اس وجہ سے اس کے ردو قبول کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔(صفحہ ۷۰)

الفعل الجاری مجری السنۃ (عمل قائم مقام سنت) کے منافی خبر واحد بھی قبول نہیں کی جائی گی۔ (صفحہ ۷۰،۷۱)

چوتھی کسوٹی کا تجزیہ:

موصوف نے صرف اپنی بے وزنی کتاب کو وزنی بنانے کے لئے ‘‘چوتھی کسوٹی سنت معلومہ’’کا اضافہ کیا ہے۔ جبکہ حقیقتاً یہ‘‘عمل معروف’’ ہی ہے۔جس کو موصوف کسوٹی نمبر ۲ کے تحت لکھ چکے ہیں۔

موصوف نے پھر پینترا بدل لیا اور حدیث و سنت میں ‘‘زمین و آسمان’’کا فرق رکھنا شروع کر دیا اور یہ دعویٰ پھر لوٹ آیا ہے۔ کہ سنن تواتر عملی سے ثابت ہیں حالانکہ تواتر عملی کی دلیل موصوف کے ہاں حدیث ‘‘فعلیکم بسنتی۔۔’’ہے۔جیسے کہ گزر چکا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ ہم بتائیں کیا؟

موصوف کو ‘‘اخبار آحاد’’ سے عداوت ہے۔ اسی لئے وہ جذبات میں بھول جاتے ہیں کہ اخبار صرف آحاد ہی نہیں بلکہ متواتر بھی ہوتی ہیں اور اس کا اقرار تو موصوف بھی کر چکے ہیں ۔پھر نہ جانے خلط مبحث کیوں کرتے ہیں؟

خبر واحد کے بارے میں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس سے عمل واجب ہوتا ہے۔ اور عقیدہ و عمل بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس کی حجیت و قبولیت کے دلائل موصوف کی پسندیدہ کتاب‘‘ الکفایہ’’ میں بھی بکثرت ہیں۔ امام شافعی ؒ نے ‘‘الرسالہ’’ میں ،امام بخاری ؒ نے اپنی ‘‘صحیح بخاری ’’میں، امام ابن حزم ؒ نے ‘‘الاحکام’’ میں اور

امام ابن قیم ؒ نے ‘‘اعلام الموقعین ’’ میں خبر واحد کی حجیت و قبولیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کی طرف رجوع کیا جائے۔

لٰذا موصوف خبر واحد کی عدم حجیت میں منفرد ہیں اور کسی بھی ‘‘امام حدیث کی مستند کتاب’’ سے کوئی دلیل نہیں رکھتے۔

جب سنت تواتر عملی سے ملتی ہے اور تواتر عملی کی دلیل حدیث ‘‘فعلیکم بسنتی’’ ہے اور حدیث و سنت مثل قرآن کے حجت ہے واجب الاتباع ہے، منزل من اللہ ہے تو پھر سنت کو قدیم ماننا اور حدیث کو جدید ماننا سراسر باطل ہے اور لغو ہے(تفصیل گزر چکی ہے)۔

اگر سنت ردو قبول کے معیار و پیمانہ سے نہیں گزرتی تو پھر بسا اوقات اسے موصوف رد کیوں کرتے ہیں کہ اس کی اساس قرآن پر نہیں؟ عجیب تضاد بیانی ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

الفعل الجاری مجری السنہ کے منافی خبر واحد حجت نہیں مانی جائے گی تو پھر کیا خبر متواتر مانی جائے گی؟ قبولیت خبر متواتر کی دلیل درکا ہے[1]۔

اصول اصلاحی:

---

[1] (?) ہم منتظر رہیں گے کہ موصوف کے حواری کب اس کی دلیل دیتے ہیں۔

پانچویں کسوٹی، عقل کلی

منافی عقل روایات قبول نہیں کی جائیں گی۔

یہاں زیر بحث افراد و انفار کی عقل نہیں ہے۔ صرف اس عقل سے بحث ہے جو بے لاگ ہو کر فیصلہ کرتی ہے اور جس کے فیصلوں کو اس دنیا کے تمام عاقلوں کی تائید حاصل ہے۔ (صفحہ ۷۲)

ایسی تمام روایات رد کر دی جائیں گی جو عقل کلی کے منافی ہوں گی۔(صفحہ ۷۴)

پانچویں کسوٹی کا تجزیہ:

موصوف کی بیان کردہ پانچویں کسوٹی صاحب ''الکفایہ'' کے ہاں پہلی کسوٹی کا درجہ رکھتی ہے، نیز وہ اسے خبر آحاد کے ساتھ خاص کرتے ہیں، جبکہ موصوف اسے تمام روایات پر مطلقاً جاری فرماتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں موصوف کا استدلال خطیب بغدادی ؒ کے قول سے کس طرح درست ہوگا؟

موصوف نے اس عقل کلی کو کسوٹی قرار دیا ہے جس کو دنیا کے تمام عاقلوں کی تائید حاصل ہو، کیا ہی اچھا ہوتا کہ موصوف اس ذات والا صفات کی بھی نشاندہی کر دیتے تو امت مسلمہ پریشان نہ ہوتی اور حدیث و سنت کی تفہیم میں ''عقل کلی'' کے پیمانہ سے اسے گزارنے کے لئے اسی عقل مند کے حوالہ کر دیتی۔

یقیناً ایسی روایات جو عقل کلی کے منافی ہوں انہیں ’’محل نظر‘‘ قرار دینا یا اس پر موضوع و ضعیف وغیرہ کا حکم لگانا محدثین کا ایک اصول ہے۔ مگر اس کا موصوف کے حواری کیا جواب دیں گے کہ عقل انسانی تو کسی اسلامی حکم کے منافی ہو سکتی ہے، اس جھگڑے کا فیصلہ کون کرے گا؟(تفصیلی بحث گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے)

چھٹی کسوٹی دلیل قطعی

دلیل قطعی کے منافی خبر واحد قبول نہیں کی جائے گی۔ (صفحہ ۷۴)

چھٹی کسوٹی کا تجزیہ:

موصوف نے دلیل قطعی تو لکھ دی مگر وہ ہے کیا بلا؟ کوئی تعریف نہیں کی البتہ اقسام بتا دی ہیں کہ عقلی بھی ہوتی ہے، اور نقلی بھی اور اتنی طاقت ور کہ خبر واحد(قول رسول) کو بھی رد کردے۔ سبحان اللہ !کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دلیل قطعی کا اسم تو ہے مگر مسمیٰ نہیں ہے۔

شاید اس سے مراد مولانا کے ہاں قرآن ،سنت متواتر ، عمل معروفہ اور عقلی کلی ہی سے بنی ہوئی کوئی چیز ہے جسے انہوں نے چھٹی کسوٹی کا نام دے کر اپنی چھٹی حس کو خوش کیا ہے۔

مولانا کا اعتراض خبر واحد پر ہے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا خبر متواتر اس

صورت میں قابل قبول ہوگی؟

اگر ہاں تو کیسے؟ کہ موصوف کے ہاں اس کا صحیح مسمیٰ ہی نہیں پایا جاتا ،پھر بچا کیا ہے۔‘‘مبادی تدبر حدیث’’ بے چاری۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اصول غامدی :

مبادی تدبر سنت

مولانا امین احسن اصلاحی نے ‘‘مبادی تدبر حدیث’’ لکھ کر خود ساختہ اصولوں کو محدثانہ رنگ دینے کی کوشش کی تو ان کے شاگرد رشید جناب جاوید احمد غامدی(جو بالکل انہی کے نقش قدم پر گامزن ہیں بلکہ جناب اپنے شیخ و امام سے بھی دو قدم آگے ہیں) انہوں نے بھی ‘‘اصول و مبادی’’ لکھ کر جہاں اپنے استاذ کے الفاظوں کو نئے سابقے اور لاحقے لگا دیئے وہیں چند ایک خود ساختہ اصول نام بدل کر تحریر کر دیئے ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ خود بھی اپنے استاذ کی طرح بے اصولی ہی ہیں۔

‘‘اصول مبادی ’’کے آخر میں انہوں نے مبادی تدبر سنت اور‘‘مبادی تدبر حدیث’’ ذکر کیے ہیں فقط انہی کی تحقیق و تجزیہ نگاری پیش خدمت ہے۔

لکھتے ہیں :سنن کیا ہیں؟ انہیں ہم نے اس مضمون کی تمہید میں بالکل متعین طریقے پر پیش کردیا ہے۔ (صفحہ ۷۱)

پہلا اصول یہ ہے کہ سنت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اپنے نوعیت کے لحاظ سے دین ہو۔ (صفحہ۷۲)

صحیح مسلم سے ’’انما انا بشر اذا امرتکم بشئ من دینکم فخذوا بہ‘‘ نقل کی ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں۔ علم و عقیدہ، تاریخ ،شان نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (صفحہ۷۳)

سنت کا لفظ ہی اس سے ابا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے۔ (اصول و مبادی)

غامدی صاحب کی تعریف سنت:

غامدی صاحب کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں کہ سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے:

عبادات:

(۱)نماز،(۲)زکوٰۃ اور صدقہ فطر،(۳)روزہ و اعتکاف،(۴)حج و عمرہ،(۵)قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں۔

معاشرت:

(۱)نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات،(۲)حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب۔

خوردو نوش:

(۱)سؤر ،خون، مردار اور اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت ، (۲)اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم و آداب:

(۱)اللہ کا نام لے کر دائیں ہاتھ سے کھانا پینا،(۲)ملاقات کے موقع پر السلام علیکم کہنا اور اس کا جواب،(۳)چھینک آنے پر الحمدللہ اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ (۴)نومولود کے دائیں کام میں اذان اور بائیں میں اقامت ، (۵)مونچھیں پست رکھنا،(۶)زیر ناف بال کٹنا،(۷)بغل کے بال صاف کرنا،(۸)بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا،(۹)لڑکوں کا ختنہ کرنا،(۱۰)ناک منہ اور دانتوں کی صفائی،(۱۱)استنجا ،(۱۲)حیض و نفاس کے بعد غسل ،(۱۳)غسل جنابت،(۱۴)میت کا غسل،(۱۵)تجہیز و تکفین،(۱۶)تدفین،(۱۷)عید الفطر،(۱۸)عید الاضحیٰ۔ (صفحہ ۱۰،۱۱)

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (اصول مبادی۱۰،۱۱)

اصول غامدی کا جائزہ:

غامدی صاحب کی تعریف سنت خود ساختہ و خود کشیدہ ہے، سنت کی یہ تعریف چودہ سو سال سے کسی بھی امام حدیث و فقہ نے نہیں کی نہ امام ابن تیمیہ نے نہ ہی امام ابن قیم نے اور نہ ہی امام شوکانی و شاطبی وغیرہ نے (ؒ)

مگر موصوف اکثر اپنی تقریروں میں(مذکورہ) ائمہ حدیث کا نام لے کر یہ باور کراتے رہتے ہیں کہ میں ان کے نقش قدم پر گامزن ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اگر سنت کی خود ساختہ تعریف کرنا (اصطلاحاً) غامدی صاحب کے لئے جائز ہے تو پھر یہ اجازت کسی کو بھی حاصل ہو سکتی ہے ،اور اس طرح ہر ایک کی

دینی اصطلاح اپنی ہی ہوگی اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی کے ہاں سنت دین ابراہیم ؑ کی روایت ہوگی تو کسی کے ہاں دین آدم ؑ کی روایت کے اصل تو وہی ہیں۔ کسی کے ہاں دین نوح ؑ کی روایت سنت ہوگی تو کسی کے ہاں دین عیسیٰ ؑ و موسیٰ ؑ کی روایت سنت قرار دی جائے گی، اور یہی نہیں بلکہ پھر ہر دینی حکم کی اصطلاح جدا جدا ہو جائے گی، کسی کے ہاں نماز سے مراد ‘‘نظام ربوبیت’’ ہوگا ،اور کسی کے ہاں نماز سے مراد صراط مستقیم کی پیروی ، اصطلاحات کو بدل ڈالنا منکرین حدیث (غلام احمد پرویز اور اس کے رفقاء کا طرز عمل تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

علمائے اسلام کو اس کے کفر کے فتوے صادر کرنے پڑے۔

موصوف[1] کے استاذ اور امام بھی اصطلاحات کے بدل ڈالنے کو منکرین حدیث کی جسارت قرار دیتے ہیں(دیکھئے مقدمہ تدبر قرآن) گویا موصوف صرف سنت کی اصطلاح بدل ڈالنے سے ہی اپنے استاذ کے ہاں منکر حدیث قرار پاتے ہیں۔

اہل السنہ والجماعۃ کے تمام ائمہ، فقہا اور علما کے ہاں سنت سے مراد نبیﷺ کے اقوال، افعال اور اقرار ہیں اور سنت وہ حکمت ہے جو منزل من اللہ ہے۔ جیسا کہ امام شافعی ؒ نے ‘‘الرسالہ’’ میں اور امام ابن قیم ؒ کی‘‘تفسیر قیم’’ میں لکھا ہے۔ اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نبیﷺ کے(دینی اعتبار سے)تمام اقوال و افعال اور اقرار و اثبات اللہ کی وحی کے تابع تھے۔

غامدی صاحب نے یہ کہہ کر ‘‘سنت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دین ہو’’۔

اپنی زبان وقلم سے ہی قرآن کی تحدید و تخصیص کر دی ہے ۔قرآن مجید مطلقاً کہتا ہے ‘‘لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنہ’’(سورہ احزاب) اب یہ غامدی صاحب ہی بتائیں گے کہ انہیں یہ اختیار حد بندی قرآن نے دیا ہے یا نہیں ؟

غامدی صاحب کا اس مؤقّف میں صحیح

---

[1](?)اصطلاحاً تبدیلی کے بعد ماننے کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا کہ میں سنت کو مانتا ہوں۔

مسلم کی حدیث نقل کرنا بھی عجیب ہے کہ یہ ان کے ہاں سنت سے جدا ہے اور اگر یہ صرف حدیث ہی ہے تو (ان کے ہاں) اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا۔ (اصول مبادی دیکھئے)

تو پھر یہاں پیش کر کے اس سے علم یقینی ثابت کرنا چہ معنی دارد؟ اگر مذکورہ ‘‘نظریہ خود ساختہ’’ صحیح ہے تو حدیث پیش کرنا غلط اور اگر حدیث پیش کرنا صحیح ہے تو نظریہ غلط ہوگیا۔ فافهم

سنت کو صرف عملی زندگی سے خاص کر دینا بھی غامدی صاحب ہی کا کمال ہے ۔ جس میں وہ تمام ائمہ و علما سے بالکلیہ منفرد ہیں ۔کیا غامدی صاحب بتانا پسند کریں گے کہ انہوں نے کس دلیل سے ایسا کیا ہے؟

اگر لفظ سنت ہی (جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے) دیگر معنوں سے ابا کرتا ہے تو پھر انہوں نے عبادت کی جو فہرست پیش کی ہے وہ سنت ہوئی مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ اب اگر یہ صحیح ہے تو ‘‘قانون عبادات’’[1] میں انہوں نے انہیں عبادات میں سے بعض پر لفظ فرض استعمال کیا ہے وہ کس دلیل سے ؟ کیا لفظ سنت اس سے ابا نہیں کرتا؟

عقیدہ وہ ایمانیات کو سنت سے بلا دلیل خارج کر دینا بھی غامدی صاحب کا سوء فہم ہے، کیوں کہ جب ان کے ہاں سنت وہی ہے جو دینی نوعیت رکھتی ہو

[1] (?)قانون عبادات غامدی صاحب کی کتاب ہے۔

تو پھر وہ دین کیسا ہوگا جو بلا عقیدہ و ایمان ہوگا؟

موصوف کی پیش کردہ سورہ نحل کی آیت بھی جس پیرائے میں آئی ہے اس سے مراد عقیدہ توحید ہی لیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ابراہیم ؑ نے شرک سے اپنے دامن کو بچا کر عقیدہ توحید سے وابستہ رکھا اسی طرح تم بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے عقیدہ توحید سے وابستہ رہو۔

امام قرطبی ؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ’’والصحیح الا تباع فی عقائد الشرع دون الفرع‘‘ اور اس کی دلیل ’’لکل جعلنا منکم شرعة ومنها جا‘‘ سے لی ہے۔ (تفسیر قرطبی دیکھیں)

اوریہ بات تو کسی ادنیٰ طالب علم پر بھی مخفی نہیں ہے کہ ہر عمل کے پیچھے ایک عقیدہ ہوتا ہے جو عمل کی ترغیب دیتا ہے[1]۔

عبادات میں جو سنتیں لکھی ہیں ان میں نکاح ،طلاق، ایام حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب ہیں۔

خور و نوش میں جو سنتیں لکھی ہیں ان میں سؤر ،غیر اللہ کے نام پر ذبح کردہ جانور، اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا ہے۔

رسول و آداب میں جو سنتیں لکھیں ہیں ان میں ملاقات پر السلام علیکم ،حیض نفاس کے بعد غسل ،غسل جنابت تدفین وغیرہ۔

---

[1] (؟)سنت سے عقیدہ و ایمان کے مسائل نہیں ملتے یہ بات فی نفسہ ایک عقیدہ ہے اور بلا دلیل ہے ۔

یہاں تو غامدی صاحب ان امور کو سنت سے تعبیر کر رہے ہیں، مگر آگے چل کر ایک قاعدہ ایسا لکھتے ہیں جو یک لخت ان سب کو سنت سے خارج کر دیتا ہے۔

لکھتے ہیں :عملی نوعیت کی وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہو سکتیں جن کی ابتدا پیغمبر کے بجائے قرآن سے ہوئی ہے۔(صفحہ ۷۴ اصول و مبادی) (تیسرے اصول کے تحت تفصیلی گفتگو آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ)

اب کوئی بتائے کہ ہم بتائیں کیا ؟جن چیزوں کی اوپر ہم نے سرسری نشاندہی کی ہے کیا ان کی ابتدا قرآن سے نہیں ہوتی؟ اگر ہوتی ہے تو وہ (بقول غامدی صاحب)سنت نہیں ہیں، اور جب وہ سنت ہی نہیں ہیں تو پھر انہیں سنت میں شامل کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر دین ابراہیم و سنت ابراہیمی سے کیا ملا؟

اچھا ایک اور سوال ہے کہ کیا واقعی غامدی صاحب کی پیش کر دہ فہرست سنت صرف ابراہیم ؑسے ملتی ہے؟ تو ان سے قبل کے انبیاء گویا(نعوذباللہ ،استغفراللہ) نکاح وغیرہ اور ایام حیض میں مقاربت سے اجتناب وغیرہ کو نہیں جانتے تھے۔

اگر جانتے تھے تو یہ سب ان کی سنتیں ہوئیں، نہ کہ ابراہیم ؑکی؟ مگر بات وہی ہے کہ غامدی صاحب کے تمام اصول خود ساختہ ہیں جو کسی اصول پر قائم نہیں ہیں۔

غامدی صاحب کے خود ساختہ

اصول[1] کوئی دلیل رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں مگر طاقت ضرور رکھتے ہیں جو قطعی سنت کو بھی یک لخت ختم کر دیتے ہیں۔سبحان اللہ

امام ابن رجب ؒ ‘‘جامع العلوم والحکم ’’ میں سنت کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ‘‘فعلیکم بسنتی۔۔۔۔ فیشمل ذلک التمسک بما کان علیہ ھو وخلفاؤہ الراشدون من الاعتقادات والاعمال والاقوال وھذہ ھی السنة الکاملة ولھذا کان السلف قدیما لا یطلقون اسم السنة الا علی ما یشمل ذلک کلہ’’
>
> ‘‘(نبی ﷺ کا فرمان) میری سنت کو لازم پکڑلو۔۔۔ یہ حکم ہر اس عقیدہ ، عمل اور اقوال کے تھامنے کو شامل ہے جسے صحابہ (خلفاء راشدین)نے اختیار کیا ہوا تھا۔ یہی کامل مکمل سنت ہے ،اور سلف صالحین ان تمام باتوں پر سنت کا اطلاق کرتے تھے ۔’’

غامدی صاحب کی سنت کی تعریف بالکل خود ساختہ ہے ،ان کے پاس ان کی پسندیدہ کتابوں‘‘الموافقات و اعلام الموقعین ’’وغیرہ سے کوئی دلیل نہیں نیز ہزاروں سنتوں کو فقط ستائیس[2] سنتوں میں محصور کر دینا بھی انہی کا کمال ہے۔جس میں کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ،اسی لئے وہ کہتے ہیں‘‘ہمارے نزدیک، میرے نزدیک یہ یوں ہے ’’وغیرہ وغیرہ۔

---

(1) پچھلے صفحے پر اس کی مثال گزری ہے۔

(2) پہلے ان کے ہاں سنتیں ۴۰ تھیں۔

اور ہم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ موصوف نے اپنے امام استاذ امین احسن صاحب کی طرح سنت کو گھر کی لونڈی بنا رکھا ہے۔ جب چاہا جدھر چاہا گھما دیا ،اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب اصطلاحی تعریف ہی بدل ڈالی تو پھر بچا کیا؟

تیسرا اصول غامدی

یہ ہے کہ عملی نوعیت کی وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہو سکتیں جن کی ابتدا پیغمبرکے بجائے قرآن سے ہوئی ہے۔ نبی ﷺ کے بارے میں معلوم ہے کہ آپ نے چوروں کے ہاتھ کاٹے ہیں ،زانیوں کو کوڑے مارے ہیں ، اوباشوں کو سنگ سار کیا ہے، منکرین حق کے خلاف تلوار اٹھائی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی چیز کو بھی سنت نہیں کہا جاتا۔

یہ قرآن کے احکام ہیں جو ابتداءً اسی میں وارد ہوئے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تعمیل کی ہے۔۔۔۔ کسی چیز کا حکم اگر اصلاً قرآن پر مبنی ہے اور پیغمبر نے اس کی وضاحت فرمائی ہے یا اس پر طابق النعل بالنعل عمل کیا ہے تو پیغمبر کے اس قول و فعل کو ہم سنت نہیں کہیں گے بلکہ قرآن کی تفہیم و تبیین اور اسوۂ حسنہ سے تعبیر کریں گے۔۔۔۔ (صفحہ ۷۴)

چوتھا اصول غامدی

یہ ہے کہ سنت پر بطور تطوع عمل کرنے سے بھی وہ کوئی نئی سنت نہیں بن جاتی۔۔۔۔ یہی معاملہ کسی کام کو اس کے درجہ کمال پر انجام دینے کا بھی ہے۔۔ نبی ﷺ کا وضو اور غسل اس کی بہترین مثالیں ہیں ۔۔۔۔ اس میں کوئی چیز اصل سے زائد نہیں ہے کہ اسے الگ سنت قرار دیا جائے۔۔۔۔(صفحہ ۷۴،۷۵)

ان دونوں اصولوں کا تجزیہ:

تیسرے اصول کے تحت جو کچھ غامدی صاحب نے لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی تفہیم ،تبیین ،اسوۂ حسنہ اور سنت میں باہم تفاوت ہے۔ سنت اصلاً پیغمبر کے قول و فعل اور تقریر و تصویب پر مبنی ہیں۔ اگر کسی مسئلہ کی ابتدا قرآن سے ہو تو پھر وہ سنت قرار نہیں دیا جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے غامدی صاحب کی پیش کردہ سنت کی فہرست میں
سے ایسے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے جن کی ابتدا قرآن سے ہوتی ہے مگر موصوف انہیں سنت میں شامل کرتے ہیں۔ اب اگر پہلا مؤقّف درست ہے تو دوسرا غلط اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پہلا مؤقّف غلط ہے۔ یہ فکر ی و نظری اختلاف کیوں؟ شاید صرف اس لئے کہ انہوں نے

سنت کی خود ساختہ تعریف کر کے اپنے لئے مسائل کھڑے کر لئے ہیں ۔ اگر وہ ائمہ سلف صالحین کے راستے پر گامزن رہتے ان کی اصطلاحات کے معنی نہ بدلتے تو آج پریشان ہوتے اور نہ ہی کفر و ضلالت کے فتوے ان کے تعاقب میں ہوتے۔ مگر پھر انہیں جانتا کون؟

‘‘شہرت کے ہم حریص ہیں عزت سے نہیں کام
بدنامگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟’’

غامدی صاحب پہلے کہہ چکے ہیں کہ دین دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے۔ (صفحہ ۱۰)

اور زیر نظر بحث میں ایک تیسری چیز بھی ذکر کرتے رہے ہیں اور وہ ہے اسوہ حسنہ یعنی تفہیم و تبیین قرآن سے ۔گویا ابھی تک موصوف کا ذہن انتشار و خلفشار کا شکار ہے کہ دین کے ماخذ کیا کیا ہیں؟ موصوف یہاں تو سنت اور تفہیم و تبیین کو الگ الگ ثابت کر رہے ہیں مگر کیا کیا جائے کہ اپنی کتاب ‘‘برھان’’ (جو بے برھان ہے) میں سنت ہی کو تبیین و تفہیم اور تشریح کا اختیار تفویض کرتے ہیں ۔ یہ کیا طرفہ تماشہ ہے ہمیں کوئی سمجھا دے۔

اگر تفہیم و تبیین سنت کر سکتی ہے تو پھر سنت اس سے الگ کیسے ہوگئی؟ اور ‘برہان’ کی عبارت سے تو سمجھ آتا ہے کہ موصوف نے یہاں سنت کی تعریف بھی بدل دی ہے کیوں کہ بقول ان کے سنت دین ابراہیم کی روایتوں کا نام ہے اور ان کی

تعداد ستائیس ہے۔ تو پھر تبیین و تفہیم قرآن ستائیس سنتوں میں کس سے ماخوذ ہے؟

زیر نظر سطور میں موصوف نے اوباشوں کے سنگسار کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کی ابتدا قرآن سے بتا کر اسے سنت سے خارج کیا ہے۔ ہمارا یہ سوال ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کی کس آیت سے ابتداءً ثابت ہے؟ ذرا بتائیے۔

غامدی صاحب ذرا یہ بھی بتائیں کہ آپ کے ہاں جو چیز سنت ہے وہ وحی الٰہی سے ملی ہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ کس پیغمبر پر اتری تھیں اس کی دلیل کیا ہے؟

اگر وہ واقعی وحی ثابت ہوجاتی ہیں تو ثابت ہو جائے گا کہ وحی دو طرح نازل ہوئی(۱)جلی،(۲)خفی۔

چوتھے اصول میں صرف لفاظی ہے جب کہ مفہوماً وہ تیسرے اصول ہی کا حصہ ہے اور الفاظ دیکھیں باہم متناقض ہیں۔ بطور تطوع کے سنت پر عمل سے وہ کوئی نئی سنت نہیں بن جاتی؟

۔۔۔۔ مگر اپنی اولین حیثیت میں ایک مرتبہ سنت قرار پاجانے کے بعد بار بار سنن کی فہرست میں شامل نہیں کر سکتے۔ (صفحہ ۷۴،۷۵)

ان عبارتوں سے کیا سمجھ آتا ہے ؟ حالانکہ موصوف جو خود انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ سنت قطعی ہوتی ہے(خود ہی لکھا ہے۔)جو ہر وقت سنت ہی رہے گی

چاہے ایک مرتبہ اس پر عمل ہو یا ایک ہزار مرتبہ۔

نوافل کا اہتمام کم از کم ایک مرتبہ موصوف کے ہاں سنت قرار پاتا ہے ،اس سے زیادہ نہیں کیوں کہ پھر فہرست طویل ہو کر ستائیس کے بجائے ستائیس سو بھی ہو سکتی ہے اور موصوف کے ہاں سنت یہی ہیں جو قطعی ہیں۔

غسل اور رضو کا طریقہ موصوف کے ہاں اصل سے زائد نہیں بلکہ اصل کو مکمل کردینا ہے لہٰذا سنت بھی نہیں(اور یہی تیسرا اصول ہے) بلکہ اسوۂ حسنہ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسوۂ حسنہ کہاں سے ملے گا؟ تواتر عملی سے ۔۔۔نہیں کیوں کہ اس سے تو موصوف کے ہاں سنت ملتی ہے (اگرچہ سنت کی تعریف نہ ملے) حدیث سے اسوۂ حسنہ ملے گا؟ نہیں کیوں (غامدی صاحب کو) اس سے علم یقینی حاصل نہیں ہوتا ؟ تو پھر کہاں سے ملے گا؟ شاید‘حلقہ اشراق’ ابھی اسے تلاش کر رہے ہوں گے؟ ان سے التماس ہے کہ ذرا اسوۂ حسنہ کی شرعی حیثیت بھی متعین کر دیں حجت ہے یا نہیں؟

پانچواں اصول غامدی

یہ ہے یہ وہ چیزیں جو محض بیان فطرت کے طور پر آئی ہیں وہ بھی سنت نہیں ہیں۔ الّا یہ کہ انبیاء علیہم السلام نے ان میں سے کسی چیز کو اٹھا کر دین کا لازمی جز بنادیا ہو، کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت

کھانے کی ممانعت سے متعلق نبی ﷺ کے ارشادات اسی قبیل سے ہیں۔

'۔۔۔لا اجد فیما اوحی الی' اور 'انما حرم علیکم' کی تحدید کے بعد یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کے تحت انسان ہمیشہ سے جانتا ہے ،شیر اور چیتے اور ہاتھی کوئی کھانے کی چیز ہیں ،اور نہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔۔۔' (صفحہ ۷۵،۷۶)

پانچویں اصول کا تجزیہ:

پانچویں اصول کے تحت موصوف کی قلمی موشگافی پچھلے مؤقّف سے متصادم ہے۔ گزشتہ صفحات میں لکھا تھا'سنت صرف انہیں چیزوں کو کہا جائے گا جو اصلاً پیغمبر کے قول و فعل اور تقریر و تصویب پر مبنی ہیں'۔ (مبادی صفحہ ۷۴)

اب جب کہ نبی ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کچلی والے درندے اور گھریلو گدھے وغیرہ کی حرمت سامنے آئی تو موصوف نے اسے بیان فطرت کہہ کر بیان شریعت سے جدا کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بھی سنت میں شامل نہیں۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ اگر اسے سنت میں شامل کیا گیا تو غامدی صاحب کی پیش کردہ فہرست سنت طویل [1] ہو جائے گی، اور یہ انہیں گوارا نہیں کہ اس کی قطعیت پر حرف آتا ہے۔ لہذا انہوں نے ایک نیا اصول پیش کر کے اسے سنت

---

[1] (?) اس سے بڑھ کر حدیث کے ساتھ تمسخر اور استہزا اور کیا ہوگا۔

سے ہی خارج کر دیا۔
‘جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے’۔

غامدی صاحب کو کلی طور پر یہ رد و قبول کی اتھارٹی نہ جانے کہاں سے حاصل ہوئی ہے۔ پہلے موصوف نے انبیاء کو یہ اختیاد دے دیا ہے کہ وہ اگر کسی چیز کو اٹھا کر دین کا جز بنا دیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ شکر اللہ کا موصوف نے یہ اختیار تو انبیاء کے پاس رہنے دیا۔ مگر کیا وہ اس بات پر غور کریں گے کہ نبی ﷺ کا مذکورہ جانوروں کو حرام قرار دینا اسے دین ہی قرار دینا تھا یا نہیں ؟ اگر یہ دین نہیں ہے تو کیا کسی کے لئے ان مذکورہ جانوروں کو اپنی فطرت کے تحت حلال سمجھ کر کھانا جائز ہے؟

غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کے تحت انسان ہمیشہ سے جانتا ہے۔۔۔۔ سراسر دھوکہ دہی پر مبنی لفاظی ہے کیوں کہ اگر انسان ہمیشہ سے یہ جانتا ہے کہ حرام کیا ہے اور حلال کیا ہے۔ اس کی فطرت میں شامل ہے تو پھر اس بیان نبوی کہ کیا معنی؟

کیا نبی ﷺ نہیں جانتے تھے کہ یہ مسئلہ تو سب کی فطرت میں شامل ہے۔ سب جانتے ہیں ،غامدی صاحب نے اسے بیان فطرت قرار دے کر نبی ﷺ سے وہ اختیار چھیننے کی ناپاک جسارت کی ہے جو اللہ

تعالیٰ نے ‘یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث’ (اعراف۱۵۷)(ترجمہ:پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرتے ہیں اور خبیث چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں) کہہ کر آپ کو تفویض کیا تھا اور اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ بیان شریعت ہے اور دین کا جز ہے۔

غامدی صاحب نے شریعت مطہرہ پر ایک افترا یہ کیا ہے کہ‘شریعت نے بھی ان جانوروں کی حلت و حرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ (صفحہ۴۲)

استغفراللہ ،معاذ اللہ کیا حرکت کی ہے موصوف نے! ایسے عقل کے اندھوں کو یہ آیت نظر نہیں آتی :

‘‘ولو تقول علینا بعض الاقاویل لا خذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین’’ (الحاقہ)

ترجمہ:‘‘اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگ دل ’’۔

غامدی صاحب کی اس جسارت ناپاک پر ہم انہیں کیا فتویٰ دیں ؟قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

‘‘انما یفتری الکذب الذین لا یومنون بآیات اللہ ’’ (النحل آیت ۱۰۵)

ترجمہ:‘‘آیات اللہ کے منکر ہی کذب و افترا کا راستہ اختیار کرتے ہیں’’۔

اگر شریعت میں صرف چار چیزیں ہی حرام ہیں تو پھر غامدی اور ان کے رفقاء

کتے، بلے، بندر وغیرہ کھا لیا کریں۔ کیا خیال ہے؟ اگر فطرت سے حرام ہیں تو موصوف کو کسی نہ کسی لئے تو گنجائش رکھنا ہی ہوگی کہ فطرت سب کی جدا جدا ہے۔

چھٹا اصول غامدی

یہ ہے کہ وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہو سکتیں جو نبی ﷺ نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے بتائی تو ہیں لیکن اس رہنمائی کی نوعیت ہی پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتی ہے کہ انہیں سنت کے طور پرجاری کرنا آپ کے پیش نظر ہی نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال نماز میں قعدہ کے اذکار ہیں۔ (صفحہ ۷۶)

لہٰذا سنت صرف یہی ہے کہ ہر نماز کی دوسری اور آخری رکعت میں نماز پڑھنے والا دو زانوں ہو کر قعدہ کے لئے بیٹھے۔ (صفحہ مذکورہ)

چھٹے اصول کا تجزیہ:

موصوف سنت کی خود ساختہ تعریف کر کے پھنس گئے ہیں اور پھڑا رہے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں تو کبھی کچھ ۔ پیغمبر کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کو اصلاً سنت قرار دیتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ اس کی ابتدا قرآن سے نہ ہو اور جب اس تعریف پر پوری سنت آتی ہے تو کہتے ہیں یہ سنت ہی نہیں، اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ اسی (روایت سے نہ کہ تواتر عملی سے) جس سے قعدہ کے اذکار ملے قعدہ کی

سنیت پر دلیل لے لی ہے؟ آخر کیوں؟ اور اذکار کا انکار کر دیا کیوں؟

‘‘أفتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض’’[1] (بقرة ۸۵)

یہ طرز عمل یہودو نصاریٰ کا ہے۔

اگر کلی طور پر قول و فعل اور تقریر کی روایت حجت نہیں اور سنت اس سے ثابت نہیں ہوتی تو پھر اس سے جزوی طور پر سہارا لے کر قعدے کو سنت کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟

موصوف کو چاہیئے کہ یہاں وہ گھبرا کر سنت کا انکار نہ کریں ،بلکہ اپنے استاذ و امام امین احسن کی بات مان لیں کہ ‘ایک ہی معاملے میں سنت مختلف بھی ہو سکتی ہے’۔

(مبادی تدبر حدیث)

مگر کیا کریں کہ اس اصول کو مان کر سنت کی قطعیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔قعدے کے اذکار کو غامدی صاحب سنت مانیں یا نہ مانیں ان کا اصول‘تواتر عملی’ اسے سنت ہی ثابت کرتا ہے ، اب شاید اصول ہی بدل ڈالیں۔

موصوف کے نزدیک عبادات میں نماز سنت ہے اب اگر نماز سنت ہے تو اس کی ہر ادا سنت ہوگی علیحدہ سے قعدے کو سنت قرار دینا اور اس کے اذکار کو سنت سے خارج کر دینا کس اصول سے ہے؟

اس کا معنی تو یہ ہوا کہ جاوید غامدی صاحب بھی دین و سنت کا اصل

---

[1] ترجمہ:کیا تم کتاب اللہ کے بعض حصے پر ایمان لاتے ہو اور بعض حصے کے منکر ہو؟

مرجع و ماخذ ہیں جو چاہیں دے دیں اور جس سے چاہیں روک دیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ موصوف کہیں مزاج شناس رسول ہونے کے ساتھ ساتھ رسول ہونے کا بھی دعویٰ نہ کردیں۔لا قدر اللہ لہ۔

ساتواں اصول غامدی

یہ ہے کہ جس طرح قرآن خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا، اسی طرح سنت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔سنت کی حیثیت دین میں مستقل بالذات ہے۔ (صفحہ ۷۶)

اخبار آحاد کی طرح اسے لوگوں کے فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ وہ چاہیں تو اسے آگے منتقل کریں اور چاہیں تو نہ کریں ۔لہٰذا قرآن ہی کی طرح سنت کا ماخذ بھی امت کا اجماع ہے۔ (صفحہ۷۷)

اخبار آحاد کی وضاحت بھی غامدی صاحب سے سنیئے لکھتے ہیں:

‘‘رسول ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم ‘حدیث’ کہا جاتا ہے۔ (صفحہ۱۱)

ساتویں اصول کا تجزیہ:

غامدی صاحب کی الٹی بہتی ہوئی گنگا کسی بھی عاقل کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ان کے تمام ‘اصول مبادی’ ہی خود ساختہ ہیں ، پہلے وہ سنت کو دین ابراہیم کی روایت قرار دیتے ہیں ،پھر اس کا مرجع اجماع صحابہ و تواتر عملی کو بتاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پہلی اصطلاحی تعریف سنت

کو خود اصلاح کی ضرورت ہے(جس کی وضاحت پیچھے گزر چکی ہے) سنت کا مرجع تواتر عملی کو قرار دینا یہ بھی صحیح نہیں کہ صحابہ کرام تو اس کو خود نبی ﷺ سے ہی اخذ کیا کرتے تھے ،گویا جو چیز ان کے ہاں سنت تھی وہ ہمارے ہاں غیر سنت بھی ہو سکتی ہے(اگرتائید عملی تواتر حاصل نہ ہو) اب یہ الگ الگ معیار کس دلیل پر قائم ہیں؟

جناب کے ہاں خبر واحد سے نہ قرآن ثابت ہوتا ہے اور نہ سنت ،مگر موصوف جس عمل کو چاہیں تواتر عملی کی سند مہیا کر کے اسے سنت کا درجہ دے دیں۔

موصوف کا مطلقاً ‘احادیث’ کو اخبار آحاد قرار دینا بھی ان کے تجاہل عارفانہ کی دلیل ہے۔ حالانکہ ایک مبتدی طالبعلم بھی جانتا ہے کہ احادیث متواتر بھی ہوتی ہیں ،اور آحاد بھی۔ موصوف کا‘احادیث’ کو مطلقاً اخبار آحاد کا نام دینا عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے، اور یہ بھی عجیب منطق ہے کہ اخبار آحاد بھی نبی ﷺکے قول و فعل اور تقریر و تصویب پر ہی مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسا کہ موصوف نے لکھا ہے ،جب یہ مان لیا گیا کہ یہ قول و فعل اور تقریر و تصویب رسول ﷺ ہے تو پھر یہ حجت کیوں نہیں؟ کیا موصوف نے سنت کی بھی یہی تعریف کی ہے؟ اگریہی تعریف کی ہے اور یقیناً کی ہے تو پھر اس میں اور سنت میں فرق کیا

ہوا؟

(یاد رہے کہ خبر واحد بھی موجب العلم والعمل ہوتی ہے ،دیکھئے الاحکام فی اصول الاحکام لا بن حزم)

قرآن و سنت کا ماخذ لوگوں کا قولی اور عملی تواتر کو قرار دینا گویا انہیں شارع قرار دینا ہے۔ جس چیز کو لوگوں کا قولی تواتر حاصل ہو جائے وہ قرآن بن گیا اور جسے عملی تواتر حاصل ہو جائے وہ سنت قرار پاجائے[1]۔

یہ انداز تو ‘کنویں کے مینڈک’ کا سا ہے ؟کیا انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس دنیا میں ہر قوم و ہر علاقہ میں تواتر قولی و عملی میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ کیا پھر بھی قرآن کا ماخذ ان کا تواتر قولی اور سنت کا ماخذ ان ا کا تواتر عملی قرار دیا جائے گا؟

اگر ایسا ہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کئی قسم کے مصاحف علیحدہ علیحدہ قراءات پر مشتمل وجود میں آجائیں گے، اور کئی طرح کی سنتیں ،نماز و روزہ میں گس آئیں گی۔ اور غامدی صاحب کے لئے انہیں مانے بغیر چارہ بھی نہیں ہوگا کہ مرجع و ماخذ تو یہی ہے۔

غامدی صاحب کو اس بات سے ‘مفر’ نہیں کہ تواتر عملی کو جاننے کے لئے واحد ذریعہ خبر ہے، اور اگر خبر قابل قبول نہیں

---

[1] (?)یہ حقیقت ہے کہ غامدی صاحب واحد ہیں اور ان کی خبر بھی واحد ہے۔

تو پھر سنت و بدعت میں فرق کی کیا دلیل ہوگی؟

غامدی صاحب تواتر عملی اور تواتر قولی سے کیا کچھ ثابت کرتے ہیں؟ ہمیں اس سے غرض نہیں ہمیں تو انتظار ہے کہ وہ تواتر عملی سے اپنی خود ساختہ تعریف سنت ثابت کر دیں۔

اصول غامدی:

مبادی تدبر حدیث

نبی ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقہ پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔۔۔ یہ چیز حدیث کے دائرہ ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی ﷺکی سیرت وسوانح آپ کے اسوۂ حسنہ اور دین سے متعلق آپ کی تفہیم و تبیین کے جاننے کا سب سے بڑا اور اہم ترین ذریعہ حدیث ہی ہے۔۔ (صفحہ۷۷)

ایک جگہ حدیث کے خلاف لب کشائی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

‘‘حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوء

فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے’’ (صفحہ ۴۱)

تحقیق و تجزیہ:

غامدی صاحب نے حدیث کی جو تعریف کی ہے تقریباً وہی تعریف سنت کی کی ہے ،فرق صرف اتنا ہے کہ سنت قطعی ہے یقینی ہے ،قرآن سے مقدم ہے اور اس سے عملی زندگی ملتی ہے ،جبکہ عقیدہ نہ سنت سے ملتا ہے اور نہ ہی حدیث سے!؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مان لیا کہ حدیث و سنت رسول کہ قول و فعل اور تقریر و تصویب پر مشتمل ہیں تو پھر کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ ان دونوں میں فرق ہے؟

غامدی صاحب کے مطابق اسوہ حسنہ ،تفہیم و تبیین، اور حدیث مترادف المعنی ہیں ،تو پھر یہ بات تو قرآن سے ثابت ہوگئی کہ اس سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

‘‘لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنہ’’ (احزاب)

ترجمہ:‘‘رسول اللہ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین طرز زندگی موجود ہے’’

اور اسوہ حسنہ حدیث میں ہے جس کا اقرار غامدی صاحب کو بھی ہے ،پھر کیا وجہ ہے وہ عقیدہ و عمل میں ضافہ کو حدیث سے خارج کرتے ہیں؟ اس کی دلیل ان کے پاس کیا ہے؟

اگر حدیث(اسوہ حسنہ رسول) دین کے نئے حکم کا ماخذ نہیں بن سکتی تو پھر کون ہے جسے یہ اختیار حاصل ہو؟

شاید حدیث سے بڑا ذریعہ اور کوئی نہیں ہے۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ سنت کا ذریعہ تواتر عملی نہیں بلکہ احادیث ہیں جو صحیح سنتوں کا تعین کرتی ہیں۔

غامدی صاحب کا مطلقاً احادیث کو اخبار آحاد کہنا تجاہل عارفانہ ہے، سب جانتے ہیں کہ احادیث متواترہ بھی ہیں اور آحاد بھی۔ (دیکھئے علوم الحدیث از صبحی صالح)

وضوء میں کلی کرنا، ناک میں پانی دے کر اسے جھاڑنا، کانوں کا مسح کرنا، اور ایک مرتبہ سے زیادہ (تین تین مرتبہ) اعضاء وضو کو دھونا ایک عمل ہے۔ جو قرآن میں نہیں بلکہ سنت سے ثابت ہے اور قرآن سے زائد عمل ہے اور یہ عمل احادیث سے ہی ہمیں ملتا ہے کہ، سنت کا ماخذ یہی ہیں لہذا ثابت ہوا کہ احادیث سے عمل دین میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

غامدی صاحب کو چاہیئے کہ اپنی پسندیدہ کتب 'الموافقات' اور 'اعلام الموقعین، الرسالہ' وغیرہ کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔

سنت و احادیث میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی لئے غامدی صاحب فرق خود ساختہ کرتے کرتے بھی پھسل گئے، اور لکھ بیٹھے 'وحی خفی' سے جو ملے وہ پیغمبر کی حدیث و سنت کہلاتی ہے'۔ (برہان[1])

دیکھ لیا آپ نے حدیث 'وحی خفی' ہے اور پیغمبر کی سنت بھی ہے۔

آگے جو غامدی صاحب نے حدیث سے نسخ اور تحدید و تخصیص قرآن کو قلت،

---

[1] 'برھان' غامدی صاحب کی کتاب ہے۔

تدبر اور سوء فہم قرار دیا ہے۔ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ واقعی ان کے ہاں تو یہ حال ہے کہ وحی خفی یا جلی یہاں تک کہ اللہ کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ (صفحہ ۲۶ مبادی)

اب بتائیں پیغمبر و قول پیغمبر سے تو اختیار تحدید و تخصیص چھین لیا مگر خود جو چاہیں کرتے پھریں۔ جس کی مثال ہم نے پیچھے ذکر کی ہے کہ عام حکم ہے ‘لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ’ اور ‘وما آتاکم الرسول فخذوہ’ مگر غامدی صاحب نے تخصیص کر دی کہ عقیدے و ایمانیات نہیں بلکہ فقط عملی زندگی سنت سے ملتی ہے جبکہ (ما انزل اللہ بھا من سلطان)،اس کی کوئی سند اللہ نے نازل نہیں کی۔

غامدی صاحب کے اس مؤقّف میں کوئی بھی امام حدیث ان کا ہمنوا نہیں ہے ، بلکہ امام شاطبی ؒنے ‘الموافقات’ میں ،امام ابن قیم ؒنے ‘اعلام الموقعین’ میں ،امام شافعی ؒنے‘الرسالہ ’ میں ،اور امام ابن حزم نے ‘الاحکام ’ میں ثابت کیا ہے کہ حدیث و سنت سے قرآنی حکم کی تحدید و تخصیص ہو سکتی ہے۔

نیز یہ کہ جناب کے امام و استاذ بھی اس کے ایک حد تک قائل تھے۔

)
دیکھئے مبادی تدبر

حدیث)

جب غامدی صاحب کے بقول حدیث سے حاصل ہونے والا علم درجۂ یقین تک نہیں پہنچتا (صفحہ۱۱) تو پھر اس ذریعے سے حاصل ہونے والی سیرت ، سوانح ، تفہیم و تبیین درجۂ یقین تک کیسے پہنچے گی؟ اور جب یقین ہی نہیں ہوگا تو اس سے استفادہ کس طرح ہو سکے گا؟

اصول غامدی:

حدیث کی سند

نبی ﷺ کی نسبت سے جو چیز کسی بات کو حدیث کے درجے تک پہنچاتی ہے، وہ اس کی سند ہی ہے۔ راویوں کی عدالت ان کا ضبط اور سلسلۂ روایت کا اتصال ہے۔ سند کی تحقیق کے لئے یہ معیار محدثین نے قائم کیا ہے اور ایسا قطعی ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔

حدیث کا متن

سند کی تحقیق کے بعد دوسری چیز حدیث کا متن ہے۔ لیکن ہر انسانی کام کی طرح حدیث کی روایت میں بھی جو فطرتی خلا اس کے باوجود باقی رہ گئے ہیں ان کے پیش نظریہ دو باتیں اس کے متن میں بھی لازماً دیکھنی چاہیئں۔

ایک یہ کہ اس میں کوئی چیز قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔

دوسری یہ کہ علم و عقل کے مسلمات کے خلاف نہ ہو۔ اگر کوئی چیز قرآن کے خلاف ہے تو اسے لازماً رد ہونا چاہیئے۔

(صفحہ ۷۸،۷۹)

خطیب بغدادی ؒلکھتےہیں:

‘‘ولا یقبل خبر الواحد فی منفاۃ حکم العقل ’’

خبر واحد اس صورت میں قبول نہیں کی جاتی جب عقل اپنا فیصلہ اس کے خلاف سنادے وہ قرآن کے کسی ثابت اور محکم حکم کے خلاف ہو، سنت معلومہ یا ایسے کسی عمل کے خلاف ہو جو سنت کی طرح معمول بہ ہو، کسی دلیل قطعی سے اس کی منافات بالکل واضح ہو جائے۔

(صفحہ ۸۰)

اصول غامدی کا تجزیہ:

تعجب ہے کہ آنجناب پچھلے آسمانی صحائف جو تحریف شدہ ہیں ،منسوخ ہیں ، ان کی قبولیت میں نہ کوئی سند کی قید لگاتے ہیں اور نہ متن کی۔

جب کہ حدیث کو قبول کرنے کے لئے ایسے ایسے اصول سامنے لے آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے حدیث کے بارے میں شکوک و شبہات جنم لیتے ہیںَ

غامدی صاحب نے سنت کی قبولیت میں بھی سوائے تواتر عملی اور اجماع کے کوئی قید نہیں لگائی اب نہ جانے ان کے پاس اپنے اس اصول کی کیا سند ہے؟

سنت اور حدیث میں فرق کے لئے غامدی صاحب نے کس سند کو استعمال کیا ہے ،وہ آج تک تو نہیں ملی؟ اگر حدیث کی سند ہی اسے قول و فعل رسول قرار دلواتی ہے تو ہم یہ بات لکھ چکے ہیں کہ سنت کے حصول کا ذریعہ بھی صرف اور صرف خبر (حدیث) ہے ۔کوئی عمل اس

وقت تک سنت قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ اس کی سند صحیح ثابت نہیں کر دی جائے ،اور سند کتب حدیث میں ملے گی۔

امام ابن اثیر نے(اور بہت سے ائمہ نے) بہت پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ سنت وحدیث میں کوئی فرق نہیں ۔لکھتے ہیں:

''ویقال فی ادلة الشرع الکتاب والسنة أی القرآن والحدیث[1]'' (النہایہ)

غامدی صاحب نے حدیث کے لئے سند کی شرط لگا کر اپنے استاذ و امام کا بھی رد کر دیا ہے (اگرچہ سند کی بات صحیح ہے) استاذ سند سے زیادہ معنی و مفہوم کی بات کرتے ہیں۔ (مبادی تدبر حدیث)

غامدی صاحب ایک طرف تو محدثین کے معیاری کام کو قطعی کہہ رہے ہیں، جس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی اور دوسری طرف اسے انسانی کام قرار دے کر اس میں خلا بھی دکھا رہے ہیں۔

اب اگر پہلی بات صحیح ہے تو دوسری بات غلط اور اگر دوسری صحیح ہے تو پہلی بہر حال غلط ثابت ہوتی ہے۔

غامدی صاحب سند میں راویوں کی عدالت، ان کا ضبط اور سلسلہ روایت کا اتصال لازم قرار دیتے ہیں، اور اس معیار کا اطلاق بے لگام طریقہ پر کرنے کا حکم صادر فرماتے ہیں چاہے روایات امہات کتب ہی میں کیوں نہ ہوں۔

شاید غامدی صاحب کے استاذ امین

---

[1] (؟)ترجمہ:''ادلہ شرعیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کتاب و سنت یعنی قرآن و حدیث''۔

احسن صاحب اس ‘قطعی معیار’ کو نہیں جانتے تھے یا جانتے تو تھے مگر مانتے نہیں تھے۔ اسی لئے انہوں نے ‘مبادی تدبر حدیث’ میں ‘ضعیف جداً’ کے ساتھ ساتھ موضوعات شریف بھی لکھ ماری ہیں۔ بہر حال یہ استاد و شاگرد کا مسئلہ ہے۔

امہات کتب پر بھی ‘اطلاق معیار’ لاگو کرنا ضروری ہے مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ائمہ محدثین رحمہم اللہ سارے معیارات کا اطلاق ان پر کر چکے ہیں، اسی لئے انہیں صحیحین اور صحیح بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا خطاب دے چکے ہیں۔ نیز شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے: ‘من یھون امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المومنین’ بخاری و مسلم کی شان گھٹانے والا بدعتی ہے اور اجماع امت مسلمہ سے منحرف ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

اب غامدی صاحب ‘اطلاق معیار’ علی امہات الکتب کا فتویٰ صادر کر کے شاید انہیں طلاق دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا یہ مشورہ ہے کہ موصوف اس کام سے باز ہی رہیں کہ وہ اس کے اہل نہیں اور ائمہ محدثین اس کام سے فارغ ہو چکے۔

متن حدیث کے بارے میں یہ قید کہ قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو اور علم و عقل کے مسلّمات کے خلاف نہ ہو۔ متن حدیث کو بھی ائمہ محدثین پر کھ چکے ہیں اور ان کا یہ کام بالکل قطعی ہے، مذکورہ اصول انہوں نے ہی بیان کیے ہیں،

مگر اس کا خود ساختہ معنی جو غامدی صاحب لینا چاہتے ہیں وہ یہاں مراد نہیں ہے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ ضعیف و موضوع حدیث قرآن و سنت اور علم و عقل کے خلاف ہوتی ہے ،اور یہ کام اس فن کے ماہر ہی کر سکتے ہیں۔

خبر واحد کی قبولیت میں جو قیودو شروط خطیب بغدادی نے بیان کی ہیں غامدی صاحب نے ان کا مطلقاً استعمال کر کے خبر متواتر کو بھی رد کر دیا ہے جیسے قراءات سبعہ اور مسئلہ رجم کی روایات۔ (البرھان اور فتح القدیر دیکھئے[1])

صاحب الکفایہ نے جو علت بیان کی ہے غامدی صاحب اس کو گول کر گئے ہیں وہ لکھتے ہیں:‘والعلة فی ذلک اذا لم یعلم ان الخبر قول رسول اللہ ﷺکان ابعد من العلم بمضمونہ’اسی کی علت(یعنی قرآن و سنت اور علم و عقل کے خلاف عدم قبولیت) یہ ہے کہ جب خبر کا قول رسول ہونا ہی معلوم نہیں تو اس سے علم یقینی حاصل ہونا اپنے مضمون سے بہت دور ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ جب عقل کی بات ہوگی تو ہر کس و ناکس کی عقل مراد نہیں ہوتی بلکہ غامدی صاحب کے استاذ کے بقول وہ عقل مراد ہے جس کو دنیا کے تمام عاقلوں کی تائید حاصل ہو۔

خطیب بغدادی ؒکی بات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں اس خبر واحد

---

[1] البرھان امام زرکشی رحمہ اللہ کی اور فتح القدیر امام شوکانی رحمہ اللہ کی تالیف ہے۔

کی بات کر رہے ہیں، جو ضعیف ہو نہ کہ مطلقاً خبر واحد کہ وہ منکر ہیں۔ غامدی صاحب کی طرح۔

خطیب بغدادی ؒ تو خبر واحد کو حجت مانتے ہیں لکھتے ہیں (یحییٰ بن محمد کا قول):

''لا یکتب الخبر عن النبی حتی یرویہ ثقة عن ثقة حتی یتناهی الخبر الی النبی بهذہ الصفة ولا یکون فیهم رجل مجهول ولا رجل مجروح فاذا ثبت الخبر عن النبی بهذہ الصفة وجب قبولہ والعمل بہ وترک مخالفتہ'' (الکفایة)

ترجمہ:''نبی ﷺ سے منقول خبر نہ لکھی جائے جب تک کہ ثقہ روای ثقہ سے روایت نہ کرے، یہاں تک کہ خبر (اسی طرح)نبی ﷺ تک جا پہنچے اور اس میں کوئی راوی مجہول و مجروح نہ ہو، جب اس طرح خبر نبی ﷺ سے ثابت ہو جائے تو اس کا قبول کرنا واجب ہے، اس پر عمل کرنا بھی واجب ہے ،اور پھر اس کی مخالفت چھوڑدینا بھی واجب ہے''۔

الکفایہ میں باب قائم کرتے ہیں 'باب ذکر بعض الدلائل علی صحة العمل بخبر الواحد ووجوبہ[1]'

اس باب کے آخر میں لکھتے ہیں:

''وعلی العمل بخبر الواحد کان کافة التابعین ،ومن بعدهم من الفقهاء الخالفین فی سائر امصار المسلمین الی وقتنا هذا ولم یبلغنا عن احد منهم انکار لذلک ولا اعتراض علیہ فثبت ان من دین جمیعهم وجوبہ اذ لو کان فیهم من کان لا یری العمل بہ لنقل الینا الخبر عنہ بمذهبہ فیہ واللہ اعلم''

---

[1] اس بات کے بعض دلائل کا بیان کہ خبر واحد پر عمل درست اور واجب ہے۔

ترجمہ:‘‘اور خبر واحد پر عمل کے قائل تو تمام تابعین اور اِن کے بعد کے فقہا ہیں جو مسلمانوں کے تمام ممالک میں پھیل چکے ہیں، آج ہمارے زمانے تک یہی کیفیت ہے اور کسی ایک سے بھی ہمیں اس کا انکار یا اس پر اعتراض نہیں پہنچا،تو ثابت ہوا کہ ان تمام لوگوں کے دین میں سے ہے کہ خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے، اور اگر کوئی ایسا ہوتا کہ(خبر واحد پر) عمل کو جائز نہ سمجھتا تو اس کی خبر ہم تک نقل ہو کر پہنچتی،واللہ اعلم’’

جہاں تک بات ہے قرآن و سنت اور علم و عقل کے مخالف و معارض ہونے کی تو اس سلسلے میں بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر شخص اس کا اہل نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی صحیح خبر کبھی قرآن و سنت اور علم و عقل کے معارض ہوتی ہے البتہ ممکن ہے کہ کم علمی کی وجہ سے ظاہراً ایسا محسوس ہوتا ہو تو اس کے لئے اس فن کے ماہرین سے رجوع کرنا چاہیئے۔

ہماری ان باتوں کی تائید خطیب بغدادی اس طرح کرتے ہیں :

‘‘یقول (ابن خزیمۃ)لا اعرف انہ روی عن رسول اللہ ﷺ حدیثان باسنادین، صحیحین متضاد ان فمن کان عندہ فلیأت بہ حتی اؤلف بینھما’’

ترجمہ:‘‘امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ نبی ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ منقول کوئی دو حدیثیں بھی ایسی ہوں جو باہم متضاد ہوں، اور اگر کسی کے پاس ہیں تو وہ اسے میرے پاس

لئے آئے میں اِن دونوں میں تضاد کو ختم کر کے توفیق کی راہ بنا دوں گا’’

مزید لکھتے ہیں:

’’وکل خبرین علم ان النبی تکلم بهما فلا یصح دخول التعارض فیهما علی وجہ وان کان ظاہرهما متعارضین لان معنی التعارض بین الخبرین والقرآن من امر ونهی وغیرذلک ان یکون موجب احدهما منافیاًلموجب الآخر وذلک یبطل التکلیف ان کانا امراً ونهیاً واباحة وحظراً أویوجب کون احدهما صدقاً والآخر کذبا، إن کانا خبرین والنبی منزہ عن ذلک اجمع’’ (الکفایة)

ترجمہ:’’ہر وہ دو خبریں جن کا نبی ﷺ سے منقول ہونا معلوم ہو جائے تو ان میں کبھی بھی (حقیقی)تعارض داخل نہ ہوگا البتہ ظاہر میں تضاد محسوس ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ تعارض کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور خبر(حدیث)میں امر، نہی، وغیرہ میں اس طرح تعارض ہو کہ ایک اگر وجوب بتلائے تود وسر اس کے برعکس اور یہ چیز مکلف سے ذمہ داری کو ہٹا دیتی ہے ،اگر چہ وہ (ذمہ داری) نہی، اباحت اور منع میں ہی کیوں نہ ہوں یا پھر (تعارض اس طرح ہو کہ) ایک چیز تو سچ ثابت ہو اور دوسری جھوٹ اور ہوں دونوں ہی اخبار ،تو (یاد رکھنا چاہیئے کہ)نبی ﷺتو ان تمام نقائص سے پاک و منزہ ہیں’’۔(یعنی حقیقتاً ایسی تضاد بیانی کبھی نہیں ہو سکتی)

اصول غامدی:

اس کے بعد فہم حدیث کے مبادی کو لیجئے۔

عربیت کا ذوق:

قرآن کی طرح حدیث کی زبان بھی عربی معلی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حدیث کی روایت زیادہ تر بالمعنی ہوئی ہے۔

چنانچہ ضروری ہے کہ حدیث کے طلبہ بار بار کے مطالعہ سے اس زبان کی ایسی مہارت اپنے اندر پیدا کر لیں کہ نہ ‘الشیخ والشیخۃ’ جیسی چیزوں کو محض زبان ہی کی بنیاد پر رد کر دینے میں انہیں کوئی تردد ہو اور نہ البکر بالبکر جیسے مشکل اسالیب کو سمجھنے میں وہ کوئی دقت محسوس کریں۔ (۸۰،۸۱)

اصول غامدی کا تجزیہ:

پہلی بات تو یہ کہ موصوف نے یہاں بھی محدثین کی اصطلاح کے خود ساختہ معنی بنا لئے ہیں۔ محدثین نے ذوق عربی کو حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا معیار نہیں ٹھہرایا بلکہ یہ کہا ہے کہ ضعیف و موضوع حدیث میں عربی فصاحت و بلاغت نہیں ہوتی۔

اس کا یہ معنی نہیں کہ اپنی کم علمی کی وجہ سے عام سطح کے لوگ اور پھر ان کے حواری کسی حدیث کو غیر فصیح قرار دے کر منکرین حدیث کی صف میں شامل ہو جائیں۔

غامدی صاحب کا احادیث کی روایت کو زیادہ تر بالمعنی قرار دینا ان کا اپنا مخصوص ذہن و مطالعہ ہے ،نہ جانے وہ کس مطالعہ سے اپنے اندر‘رد حدیث ’کی مہارت حاصل کر بیٹھے ہیں؟

شاید غامدی صاحب اس مؤقّف میں ڈانواں ڈول ہیں اسی لئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

‘‘نبی ﷺ کی دعاؤں ،تمثیلات اور صحابہ کے ساتھ آپ کے مکالمات میں چونکہ بالعموم روایت باللفظ کا اہتمام ہوا ہے’’۔ (اصول مبادی صفحہ ۱۵)

محدثین کے ہاں اصل روایت باللفظ کا اہتمام ہے اور روایت بالمعنی مشروط طور پر فقط جواز کی صورت ہے اس کی تفصیل جناب کے استاذ نے بھی لکھ رکھی ہے۔ (دیکھئے مبادی تدبر حدیث)

غامدی صاحب کے ہاں بار بار کے مطالعہ سے ایسی مہارت حاصل ہوتی ہے کہ پھر الشیخ والشیخة کی فصاحت بھی اس مہارت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ کلام نبوت سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ماہر فن ،ربّانی علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے بغیر چارا نہیں ۔

اگر لفظ الشیخ والشیخة غیر فصیح ہے عربی ذوق کے منافی ہے تو پھر اس کا علم سب سے پہلے کس امام حدیث و لغت کو ہوا؟ نہ خطیب بغدادی ہی موصوف کے ساتھ ہیں اور نہ صاحب لسان العرب و مصباح اللغات ،سب نے شیخ کی مؤنث شیخہ ہی لکھی ہے۔

اور لفظ شیخ تو قرآن میں مستعمل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے محترم اور ان کے حواری قرآن کی عربی زبان پر کیا مہارت دکھاتے ہیں؟ ایسے میں کھسیانی

بلی کھمبے نوچے اور انگور کھٹے ہیں ،جیسی مثالیں ہی موصوف پر صادق آتی ہیں۔

محدثین نے جو‘رکاکۃ لفظی’ کی بات کی ہے تو اس کی بھی وضاحت سن لیجئے کہ اس سے کیا مراد ہے ،تاکہ کوئی ‘عجمی غامدی’اشتباہ پیدا نہ کر سکے۔

امام سیوطی ؒ‘تدریب الراوی’ میں شیخ الاسلام سے نقل کرتے ہیں:

‘‘المدار فی الرکۃ علی رکۃ المعنی فحیثما وجدت دل علی الوضع وان لم ینظم الیہ رکۃ اللفظ ،لان ھذا الدین کلہ محاسن والرکۃ ترجع الی الرداءۃ□□□□□’’

ترجمہ:‘‘رکت(کمزوری) کا دارو مدار فقط معنی پر ہے ،پس اگر معنی میں رکاکت پائی گئی تو یہ وضع کی دلیل ہوگی اگرچہ الفاظ کی رکاکت اس کا اظہار نہ کرے، کیوں کہ دین مکمل طور سے محاسن و جمال کا نام ہے ،جب کہ رکاکت غیر محاسن کی طرف راجع ہے’’

‘‘وقال امارکۃ اللفظ فقط فلا تدل علی ذلک لا حتمال ان یکون رواہ بالمعنی فغیر الفاظہ بغیر فصیح□□□’’

ترجمہ:‘‘اور یہ بھی کہا کہ اگر صرف الفاظ میں رکاکت ہو تو یہ وضع کی دلیل نہ ہوگی ،کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ راوی نے(اس روایت کو) بالمعنی بیان کیا ہو اور اس بیان میں فصیح الفاظ کو غیر فصیح سے بدل دیا ہو’’

گویا یہ اقوال ،نظریہ غامدی کی بھر پور تردید کرتے ہیں، جو صرف لفظ حدیث پر ہی فتویٰ دیدیتے ہیں کہ یہ حدیث ہی

نہیں۔

غامدی[1] صاحب کے استاذ کے بقول ‘مؤطا’ امام مالک میں امام صاحب نے روایت باللفظ کا بڑا اہتمام کیا ہے، اور امام مالک نے بھی اس روایت الشیخ والشیخة کو اپنی مؤطا میں نقل کیا ہے، جو اس کے الفاظ کے فصیح عربی ہونے کی نشاندہی ہے اور اس بات کی نفی ہے کہ یہ بالمعنی ہے۔

اصول غامدی:

قرآن کی روشنی

دوسری چیز یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے۔ نبی ﷺ نے اپنی حیثیت نبوت و رسالت میں جو کچھ کیا اس کی تاریخ حتمی اور قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔ عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل، عذاب قبر اور شفاعت کی روایتیں انہیں قرآن میں ان کی اصل سے متعلق کر کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

(صفحہ ۸۱)

اصول غامدی کا تجزیہ:

موصوف کا حدیث کے لئے قرآن کو کسوٹی بنا دینا بھی بلادلیل اور خود ساختہ اصول ہے۔ کیونکہ حدیث تو خود ہی ماخذ شریعت ہے، اگرچہ یہ بھی مسلم ہے کہ وہ قرآن کا بیان ہے مگر یاد رہنا چاہیئے کہ یہ بیان بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے

---

[1]) غامدی صاحب کی عربی دانی اس قدر فصیح ہے کہ جناب لفظ مصلح کو عربی میں غامدی بنا بیٹھے ہیں، حالانکہ ‘‘مصلح’’ خود ہی عربی لفظ ہے۔

ذمہ لے کر نبی ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے کہلوایا ہے۔ جس کی دلیل 'ثم علینا بیانہ[1]' اور 'وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم[2]' اور' وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی[3]' کی آیات بینات ہیں۔

حدیث کے لئے قرآن کی روشنی کو لازم قرا دینا اور بصورت دیگر حدیث کو رد کر دینا دراصل قرآنی حکم 'لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ[4]' اور' وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا[5]' کی صراحتاً خلاف ورزی ہے۔

یاد رہے کہ ہم 'برہان' سے یہ نقل کر چکے ہیں کہ غامدی صاحب حدیث کو وحی خفی مانتے ہیں ۔کیا اب بھی وہ قرآن کی روشنی کی محتاج ہی رہے گی؟ تو پھر حدیث کو ماننے کا فائدہ کیا ؟جو کچھ مانا وہ تو قرآن میں ہی ہے۔

موصوف روانی میں لکھ گئے کہ نبی ﷺ نے اپنی حیثیت نبوت و رسالت میں جو کچھ کیا اس کا قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ موصوف اس کی کوئی مثال ہی بیان فرمادیتے ،مگر شاید

---

[1] پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔

[2] اور ہم نے آپ پر یہ ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں پر واضح کردیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔

[3] وہ اپنی خواہشات سے گفتگو نہیں کرتے ،مگر وہی کہتے ہیں جو وحی ان پر کی جاتی ہے۔

[4] رسول اللہ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین طریقہ زندگی موجود ہے۔

[5] اور جو رسول حکم دیں وہ لے لو اور جس سے منع کر دیں اس سے باز آجاؤ۔

قیامت تک وہ اس کی کوئی مثال پیش نہ فرما سکیں۔

اس کا معنی تو یہ ہوگا کہ نبی ﷺ ہر مسئلے میں قرآن اترنے کے منتظر رہتے تھے پھر عمل کرتے تھے؟ موصوف کو اقرار ہے کہ نبی ﷺ نے اوباشوں کو سنگسار کیا تھا۔ ذرا بتائیں کہ اس کی دلیل و ماخذ قرآن کی کون سی آیت ہے؟

یہاں موصوف نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے بحیثیت نبی جو بھی کیا اس کا ماخذ قطعی قرآن ہی ہے۔ اب یہ تو واضح ہے کہ نبی ﷺ نے جو نبوت کی حیثیت سے کیا وہ سیرت ہے، سوانح ہے اسوہ حسنہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو پھر اس کا ماخذ قرآن کیسے ہو سکتا ہے کہ پہلے تو غامدی صاحب نے لکھا تھا یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی ﷺ کی سیرت و سوانح آپ کے اسوہ حسنہ اور دین سے متعلق آپ کی تفہیم و تبیین کے جاننے کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حدیث ہی ہے۔

(صفحہ ۷۷)

کیا غامدی صاحب کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہی حدیث میں ہے تو مسئلہ ہی ختم ہے والحمدللہ علی ذلک

آگے جو کچھ بھی موصوف نے لکھا ہے وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ اگر غامدی صاحب نبی ﷺ کو وہی مقام دیدیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا ہے کہ آپ معلم کتاب و حکمت اور شارح کتاب اللہ ہیں۔

حتی کہ باذن اللہ تحلیل و تحریم کا اختیار بھی رکھتے ہیں تو پھر کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا نہ مسئلہ رجم میں نہ عذاب قبر میں نہ 'من بدل دینہ فاقتلوہ' میں، ان شاء اللہ

احادیث صحیحہ میں جو کچھ بھی وارد ہوا ہے وہ من و عن کتاب اللہ کی تشریح ہے اور تشریح کا زائد ہونا ایک واضح امر ہے۔ کوئی صاحب علم و عقل اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ 'الرسالہ' للامام شافعی اور 'اعلام الموقعین' للاما م ابن قیم 'اور الموافقات' للامامشاطبی ، تو جناب کے مکتبہ اور مطالعہ میں ضرور ہوں گی!

اصول غامدی:

موقع و محل

اس کے موقع و محل کو سمجھ کر اس کا مدعا متعین کیا جائے'۔۔۔۔الائمة من قریش'اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے ہمارے علما اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمانوں کے حکمران صرف قریش ہوں گے۔ (صفحہ ۸۲)

اصول غامدی کا تجزیہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ موقع و محل سمجھ کر حدیث کا مدعا متعین ہونا چاہیئے مگر اس کا یہ بھی معنی نہیں کہ حدیث کا موقع و محل تلاش کرتے کرتے اس میں سے برہمنیت کی بو آنے لگے۔

اور یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ آج

یہ (برہمنیت کی بو) صرف اور صرف غامدی صاحب اور استاذ غامدی صاحب ہی کو محسوس ہونے لگی ہے۔ چودہ سو سال کے عرصے میں کسی بھی امام حدیث و فقہ کو یہ نہ سمجھ آئی آخر کیو ں؟

مقام شکر ہے کہ موصوف نے اسے قرآن کی روشنی میں نہیں دیکھا ورنہ شاید'ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم' کے خلاف نظر آتی اور رد ہو جاتی۔ یہ تو جناب کی مہربانی ہے کہ وہ اس کو حدیث [1] مانتے ہیں صرف معنی و مدعا متعین کرنے میں ائمہ سلف سے انہیں اختلاف ہے۔

کسی بھی کتاب میں کسی بھی علمی شخصیت نے اس حدیث کے ظاہری معنی میں برہمنیت محسوس نہیں کی۔ اب یا تو ائمہ سلف عربی ذوق سے آگاہ نہ تھے یا پھر ان کا کام قطعی نہ تھا واللہ اعلم۔ غامدی صاحب اصل میں تجاہل عارفانہ برتتے ہیں ورنہ تو وہ خود بھی جانتے ہیں کہ اس حدیث میں شرعی حکمران(خلیفہ و امیر) کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ملوکیت و آمریت کے علمبردار حکمران ،اگر یہ خلط مبحث نہ ہو تو مسئلہ واضح ہے کہ 'الائمة من قریش' ۔

اصول غامدی:

احادیث باب پر نظر

اس میں موصوف نے لکھا ہے کہ حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اس باب کی تمام

[1] (؟)اس حدیث کا انکار سب سے پہلے معتزلہ نے کیا تھا ،موصوف اس کے معنی کے منکر ہیں۔

روایات پیش نظر رکھی جائیں۔ ۔(یہاں جناب نے تصویر کی بحث کی ہے)۔۔ (صفحہ ۸۲)

اصول غامدی کا تجزیہ:

زیر نظر بحث میں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ممانعت تصاویر کی احادیث کو مانتے ہیں مگر مدعا متعین کرنے میں ائمہ سلف صالحین سے انہیں اختلاف ہے ۔ موصوف کو اصرار ہے کہ وہ تصاویر ممنوع ہیں جو پرستش کے لئے بنائی گئی ہیں۔۔۔۔۔

بار بار کے مطالعے سے ہمیں جو بات سمجھ آئی ہے وہ یہ ہے کہ چودہ سو سال کے عرصے میں شاید موصوف ہی کو یہ بات سوجھی ہے ورنہ اہل علم و بصیرت پر مخفی نہیں ہے کہ تصویر سے ہی بت پرستی کی ابتداء ہوئی ہے ۔لہذا یہ بت پرستی کی اصل (وجہ) ہونے کی وجہ سے ممنوع قرار دی گئی ہے۔ نیز اس میں اللہ رب العالمین کی صفت تخلیق کے ساتھ مشابہت و مماثلت کو بھی وجہ ممانعت قرار دیا گیا ہے۔

اگر صرف پرستش کے لئے بنائی جانے والی تصویریں حرام و ممنوع ہیں تو کیامسلمانوں میں بھی لوگ تصاویر کی پرستش کرتے ہیں ؟اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو مسلمان نہیں رہے ،اور وہ ایسا نہیں کرتے تو روکا کیوں گیا؟ اگر انہیں نہیں روکا گیا تو ان احادیث کا مخاطب کون ؟

اگر کافر مخاطب نہیں تو یہ ایک لغو بات ہے۔ کیونکہ کہ وہ شریعت کے مکلف ہی نہیں وہ یہ حکم کیوں مانیں گے؟

تصویر کا مسئلہ:

موصوف کے حلقہ اشراق کی کتاب ‘تصویر کا مسئلہ’ پر مولانا عبدالرحمن مدنی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

‘‘تصویر کے مسئلہ پر آپ نے محمد رفیع مفتی کے جس مقالہ کا ذکر کیا ہے اس میں مفتی صاحب نے غامدی صاحب کے زیر اثر کئی جگہ اصولی غلطیاں کی ہیں کیوں کہ استدلالی علوم کے علاوہ انہیں عقائد اسلامی سے بھی زیادہ آشنائی نہیں ہے۔ مثلاً اپنی کتاب ‘تصویر کا مسئلہ’ صفحہ ۸۶ میں لکھتے ہیں:

‘یہ موحدین جو اس گرفت میں نہ آنے والے یعنی نہ دکھائی دینے والے اور نہ محسوس ہونے والے اللہ کو مانتے تھے ظاہر ہے کہ جب اس کے قائل نہیں تھے کہ اللہ کو متصور کرنا ممکن بھی ہے اور اعتزالی عقائد کے زیر اثر دنیا و آخرت میں مطلقاً دیدار الٰہی کا انکار کر کے اپنے طور پر مشبہ کا رد کر رہے ہیں حالانکہ یہ عقیدہ جہمیہ معطلہ کا ہے جب کہ حق مشبہ اور معطلہ کے درمیان ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں’۔

اسی طرح وہ سیدنا سلیمان ؑکے بارے میں سورہ سبا کی آیت نمبر ۱۳ میں ’تماثیل ’ کے ذکر سے اپنے استدلال کو مضبوط بنانے کے لئے شرائع اسلامیہ کا تصور ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:
‘تماثیل اگر شر ہیں تو ہمیشہ کے لئے ہیں اور اگر خیر ہیں تو ہمیشہ کے لئے ہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک شریعت میں جائز ہوں اور ایک میں نا جائز ہے۔ الخ(ص۔۲۳)

غامدی فکر کی بڑی اساس اسرائیلیات (بائبل وغیرہ) ہیں۔ جسے وہ ‘حدیث رسول’ پر مقدم رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ بہت سے مسائل میں سابقہ شرائع کے تنوع کے قائل نہیں۔ جب کہ محمدی شریعت میں ایسے کئی مسائل موجود ہیں جو کسی سابقہ شریعت میں جائز ہونے کے باوجود آخری اور اکمل حکم کے طور پر نا جائز قرار پائے۔ مثلاً سجدۂ تعظیمی جو فرشتوں سے آدم ؑکو کروایا گیا اور سیدنا یوسف کو ان کے ماں باپ سمیت تمام بھائیوں نے کیا ۔لیکن شریعت محمدیہ میں یہ سجدۂ تعظیمی ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا گیا۔
ان تحفظات کے باوجود محمد رفیع مفتی صاحب کی تصویر کے مسئلے پر یہ تحریر اس اعتبار سے اچھی نظر آئی کہ انہوں نے قرآن و حدیث کے درمیان تضاد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صحابہ کرام، تابعین عظام، کے علاوہ فقہائے سلف کو بھی ایک

موقف (خواہ ادھورا ہی) پر متفق بنانے کی کوشش کی ہے جو اِن کی نظر میں کتاب و سنت ہی کا کامل مفہوم ہے۔

اس تاثر کو قائم رکھنے کی حد تک تو اِن کی کاوش اچھی لگی لیکن اس کے لئے انہوں نے احادیث کا جا بجا ذکر کر کے تصویر کی شرعی حیثیت اور سلف کا یک رخا موقف واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں محمد رفیع مفتی صاحب کے شرعی فتویٰ سے تو اختلاف ہے۔ لیکن اِن کا انداز استدلال کم از کم اشراق کے حلقے سے متاثر ہونے والے ایک شخص کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ کاش کہ وہ اِن خطرات کو بھی ملحوظ نظر رکھ سکتے جو ان کی اس موضوع پر ''ناقص بحث'' سے تصویر کی کھلے عام اباحت پر منتج ہو سکتے ہیں۔کل کلاں کوئی من چلا یہ بھی آواز لگا سکتا ہے کہ 'شبیہ رسول یا تصاویر انبیاء کی اشاعت بھی صرف کراہت کے درجے میں ہے، اس پر امت مسلمہ کو غیرت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔'

ہمارے ہاں دینی حلقوں میں بھی سیاست کے غلبے کی وجہ سے سیاست دان علما جس طرح اب کھلے عام تصویر نمائی سے کام لے رہے ہیں، باوجود یہ کہ اِن کے اکابرین کچھ عرصہ پہلے تک اس کی حرمت پر متفق نظر آتے ہیں ، تو عوام میں غیر محتاط تصاویر کا استعمال یوں نظر نہ آتا ۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مغرب کی اندھا دھند تقلید کے لئے اباحتِ مطلقہ کے

رویے سے بچ کر سلف صالحین کے طور طریقوں کی اقتدا پر زور یں‘واتبع سبیل من اناب الی/ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضالین’ (لقمان۱۵، فاتحہ۷)
یعنی ہمارے جانب عاجزانہ رجوع کرنے والے کی پیروی کرے
یا اللہ! ہمیں اِن لوگوں کی راہ پر ڈال جو مغضوب علیہم (یہود) اورگمراہ (نصاری) سے علیحدہ ہو کر تیرے انعام کے حامل ہوئے’۔
بقولِ اقبال:
زتقلید عالمان کم نظر اقتدا بررفتگان محفوظ تر
ہماری نظر میں مفتی صاحب کا تصویر کے مسئلہ میں نقطہ نظر ادھورا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصول فقہ(علم استدلال)سے نا واقف ہیں۔ فقہا شرعی احکام کا تجزیہ کرتے ہوئے حرمت کی دو قسمیں کرتے ہیں:
(۱)قبیح لعینہ (۲)قبیح لغیرہ
اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مفتی صاحب کا یہ موقف درست ہے کہ تصویر قبیح لعینہ یعنی فی نفسہ حرام نہیں جیسا کہ اِن کے سارے دلائل اسی کے گرد گھوم رہے ہیں تو قبیح لغیرہ◆ ضرور ہے۔ اگرچہ قبیح لغیرہ◆ ہونے کی بنا پر کئی مواقع پر تصویر کا جواز نکل آئے گا جیسے تعلیم و تربیت کے لئے(جیسا کہ سیدہ عائشہ کے پاس گڑیاں وغیرہ تھیں)یا اہانت ملحوظ رکھتے ہوئے گدوں اور تکیوں کی صورت میں کٹی پھٹی تصویروں کا استعمال

تاہم شریعت میں عمومی طور پر تصویر اتارنے والوں کی مذمت اور تصویروں کی نمائش ممنوع ہی رہے گی۔
کون کہہ سکتا ہے کہ اگر محترم سیاسی یا مذہبی شخصیتوں کی کھلے عام تصویر کشی یا تصویر نمائی کی اجازت دے دی جائے تو یہی شخصیتیں کبھی اس طرح مقدس حیثیت اختیار نہ کر جائیں گی ، جس طرح قوم نوح کے صالحین کی تصویریں ہی اِن میں بت سازی اور بت پرستی کا باعث بنی تھیں۔ اسی لئے ماضی قریب تک علما بلکہ مسلم دانشور بھی تصویر کی حرمت کا فتویٰ دیتے رہے جس میں نمایا مثال مولانا مودودی کی ہے۔ (حافظ عبدالرحمن مدنی)

اصول غامدی:

عقل و نقل

عقل و نقل میں ہر گز کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ دین کی بنیاد ہی علم کے مسلّمات پر قائم ہے۔ (صفحہ ۸۳)

اصول غامدی کا تجزیہ:

یقیناً دین کی بنیاد ہی علم و عقل کے مسلمات پر قائم ہے مگر اس کا کیا کیجئے کہ بعض لوگ ‘عربی ذوق’ رکھنے کے باوجود عقل سے کورے ہوتے ہیں؟
اب نقل سے مراد تو یقیناً روایات صحیحہ ہیں عقل سے مراد کس کی عقل ہے؟ یہ بات وضاحت طلب ہے اور وضاحت غامدی صاحب نہیں کر سکے۔

اور یہ کوئی علمی طریقہ نہیں ہے کہ اس طرح کے مواقع پر آدمی فوراً حدیث کو رد کر کے فارغ ہو جائے یا علم و عقل سے آنکھیں بند کر کے اس سے کوئی غلط یا مرجوح معنی قبول کر لے۔ (من اصول مبادی)

مسلمانوں کے ہاں بہرحال یہ بات مسلمہ ہے کہ (بظاہر)عقل و نقل میں اگر تعارض دکھائی دے تو نقل کو مقدم کرنا اور عقل کومؤخر رکھنا ہی سلامتی کی راہ ہے۔ اب غامدی صاحب خود کو ان میں شامل کرتے ہیں یا نہیں یہ فیصلہ انہی پر مؤقوف ہے۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا
اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

جاوید احمد غامدی کا اصل چہرہ (اقتباس از مجلہ ‘ساحل’ اگست ۲۰۰۷)

‘‘غامدی صاحب اور قرآن کے مقابلے میں ان کی آیات ،حقیقت حال’’

غامدی صاحب کی طبع زاد آیات معری کی آیات کا سرقہ ہیں

پروفیسر ڈاکٹر رضوان علی ندوی

ماہنامہ ساحل کے شمارہ مئی ۲۰۰۷ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ‘۱۹۷۵ء میں غامدی صاحب نے قرآن کا چیلنج قبول فرمالیا تھا’

ادارہ ساحل کے اس مضمون میں اس مجلس میں بعض موجود اشخاص کے حوالے

سے یہ بات کہی گئی ہے کہ سیالکوٹ میں اپنے احباب کی ایک نجی محفل میں غامدی صاحب نے قرآن کے اس چیلنج کے جواب میں کہ قرآن اور اس کی دس سورتیں تو کیا 'اے کفار مکہ! تم قرآن جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ، اور سچے ہو تو اللہ کے سوا تم جس کو چاہو (اپنی مدد کے لئے) بلا لو(یونس۔۳۸)اپنی تحریر کردہ چالیس آیتیں اس مجلس میں سنائیں۔

اس بارے میں کسی شک کی اس لئے گنجائش نہیں کہ اس مضمون میں صاحب خود اس محفل میں شریک تھے اور انہوں نے دوسرے شرکائے محفل ڈاکٹر سہیل طفیل، ڈاکٹر مستنصر میر، ڈاکٹر منصور الحمید، اسد صدیقی کے نام بھی دیے ہیں ۔ اور اس گھر کا پتہ بھی لکھا ہے جس میں یہ محفل منعقد ہوئی تھی۔(ساحل ،مئی صفحہ ۲۵)مضمون نگار نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس محفل کے بعد یہ آیتیں کتابی شکل میں اشاعت کے لئے منڈی مرید کے کے ایک کاتب سے کتابت بھی کرالی گئی تھیں۔ لیکن کتابت بہت ناقص تھی اس لئے مسودہ روک دیا گیا۔ بعد میں ڈاکٹر مستنصر میر کی زجرو توبیخ پر غامدی صاحب نے توبہ کر لی اور یہ مسودہ ضائع کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے ذکر کے بعد مضمون نگار کا کہنا ہے کہ 'راقم کے پاس اس مسودہ

کا ایک ٹکڑا محفوظ رہ گیا تھا اس ٹکڑے سے چند ‘آیات’ کی نقل من و عن حاضر ہے۔ ترجمہ غامدی صاحب کے قلم سے ہے:

‘‘اقسم بخالق الخیل، والریح الھابة بلیل بین الشرط ومطالع سھیل،ان الکافرلطویل الویل ،وان العمر لمکفوف الذیل ،اقز مدارج السیل وطائع التوبة من قبیل ،تنج وما اخالک بناج’’

ترجمہ:‘‘میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو گھوڑوں کا خالق ہے اور جو رات کو ستارۂ شرط اور سہیل کے طلوع کے مابین ہوا چلاتا ہے کہ کافر بڑے عذاب میں مبتلا ہے اور(یہ)کہ عمر کا دامن بندھا ہوا ہے۔ تو سیلاب کے (صحیح‘کی’ ہے) گزر گاہ سے بچ اور پہلے سے توبہ کر لے کہ تو نجات پا جائے مگر مجھے توقع نہیں کہ تو ایسا کرے’’۔

غامدی صاحب کی جعلی آیات کا غلط سلط اردو ترجمہ غامدی صاحب کے قلم سے ۔ غامدی صاحب اپنی آیات کا درست ترجمہ کرنے سے قاصر کیوں؟

ان ملحدانہ جعلی‘آیات’ کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل اس ترجمے کی بعض اغلاط کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے گزشتہ مضمون (ساحل ۲۰۰۷ اپریل ء) سے یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ غامدی صاحب کو عربی لکھنا نہیں آتی۔ اب چند جملوں(جن کو موصوف نے آیات کا نام دیا ہے) کے ترجمے سے پتہ چلتا ہے کہ

وہ عربی زبان ٹھیک طرح سمجھ بھی نہیں سکتے۔ کیوں کہ انہوں نے ‘الریح الھابۃ بلیل’ کا ترجمہ کیا ہے ‘اور جو رات کا ستارہ شرط کے طلوع کے مابین ہوا چلاتا ہے’۔ اس میں دو اغلاط ہیں ایک تو ‘مطالع’ کا ترجمہ طلوع کیا ہے، جو سراسر غلط ہے کیوں کہ ‘مطالع’ مطلع کی جمع ہے یعنی سہیل کے طلوع ہونے کے مقامات ۔طلوع تو‘طلع’ کا مصدر ہے یعنی طلوع ہونا۔ دوسری غلطی ہے‘ہوا چلاتا ہے ’یہ ترجمہ بھی سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ ‘الریح الھابۃ’ کے معنی ہیں چلنے والی ہوا ۔الھابۃ فعل ھب، یھب ،ھبا وھبوبا سے اسم فاعل مونث ہے اور یہ فعل لازم ہے ۔یعنی اس کے معنی ہیں چلنا(اور یہ خاص طور پر ہوا چلنے اور نیند سے اٹھنے وغیرہ کے لئے آتا ہے۔)‘ہوا چلانے’ کا معنی‘ اھب’ میں ہے جو اس فعل ھب سے فعل متعدی ہے اس طرح جملہ‘ والریح الھابۃ بلیل بین الشرط ومطالع سھیل ’کا صحیح ترجمہ ہوگا:‘اور اس کی قسم جس کے حکم سے رات کو ستارہ شرط اور مطالع سہیل کے مابین ہوا چلتی ہے۔ تیسری غلطی جو عبارت کے مفہوم کو بالکل بگاڑنے والی ہے وہ آخری جملہ‘وما اخالک بناج’ کا یہ ترجمہ ہے ۔مگر مجھے توقع نہیں کہ ایسا تو کرے ،صحیح ترجمہ ہے۔ میں خیال نہیں کرتا یا مجھے نظر نہیں آتا کہ تجھے نجات مل سکے گی۔ موصوف نے بناج کا ترجمہ تو ایسا کرے کیا ہے اور اس طرح اس لفظ

کا تعلق توبہ سے جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ آخر کے ان دو جملوں کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ:'پہلے ہی توبہ کر لے کہ تو نجات پاجائے ،لیکن میرا خیال نہیں کہ(پھر بھی) تو نجات پا سکے گا'۔ ناج وہی لفظ ہے۔ جو اردو میں بھی اپنی اصل صورت ناجی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایک نحوی علت کے سبب سے ناج ہوگیا ہے۔

یہ نام نہاد شیطانی آیات ان کی نہیں کسی اور کی تصنیف کردہ ہیں انہوں نے اپنی عربی دانی کے اظہار اور قرآن کی عربی کا مقابلہ کر نے کی قابلیت کے اظہار کے لئے ان کو اپنے نام سے منسوب کیا ہے۔

در حقیقت یہ نام نہاد یا شیطانی آیات چوتھی پانچویں صدی ہجری کے مشہور نابینا شاعر ابوالعلاء المعری کی تصنیف کردہ ہیں۔

معری کے حرف بہ حرف سرقہ کو اپنی طبع زاد آیات کہنا غامدی صاحب کا کمال ہے۔

بہر حال ہمارا موضوع اس وقت معری اور اس کی یہ کتاب نہیں ہے ،بلکہ غامدی صاحب اور إن کا یہ کارنامہ ہمارا موضوع ہے۔ کہا انہوں نے قرآن کے مقابلہ میں کچھ عربی عبارات لکھیں تھیں ان عبارات یا نعوذ باللہ آیات کے بارے میں تو معلوم ہوگیا کہ انہوں نے یہ معری سے حرف بحرف سرقہ کیا تھا ،اور جس محفل میں وہ جعلی آیات سنا رہے تھے اس میں کوئی بھی عربی زبان و ثقافت کا علم رکھنے والا

شخص نہ تھا۔ اِن کے زیادہ تر معتقدین اور شاگرد ایسے انگریزی خواں ہیں جو عربی زبان سے نا بلد ہیں جب ہی اِن کا کاروبار لاہور کے المورد اور کراچی کے دانش سرا میں چل رہا ہے۔ اور بعض ٹی وی چینلز میں اِن کی پذیرائی ہوتی ہے۔ حیرت ہے لاہور اور کراچی کے اِن بعض تاجروں پر ہے جو بڑے پیمانے اِن کی مالی امداد کرتے ہیں، دراصل ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ کبھی موصوف قرآن مقابلے میں ۴۰ آیات(جعلی) بھی لکھ چکے ہیں یہی کام تو مسیلمہ کذاب نے کیا تھا، اس کی تصنیف کردہ مقابلہ قرآن کی چند آیات عربی ادب و تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

غامدی صاحب

یاقوت معری کی زیر بحث کتاب سے جو دو نمونے پیش کیے ہیں اس میں دوسرے نمونے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ‘والشمس وضحاھا’ کے جواب میں ہے اور وہ یہ ہے‘اذلت العائذۃ اباھا وأصاب الوحدۃ ورباھا واللہ بکرمہ اجتباھا اولا الشرف بما حباھا ارسل الشمال وصباھا ولا یخاف عقباھا ’یہ تو ہم ابتداہی میں بتا چکے ہیں کہ اِن شیطانی آیات کا پہلا مجموعہ جس کو غامدی صاحب نے اپنی تصنیف کہا ہے وہ دراصل معری کی تصنیف کردہ اور الفصول الغایات سے چرایا گیا ہے۔ لیکن ان شیطانی آیات کا دوسرا مجموعہ ‘‘ان معایبی لکثیر سے علی الرباب’’ تک پانچ شیطانی آیات

پرمشتمل ہے۔اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے سامنے الفصول والغایات کا کوئی نسخہ نہیں۔ البتہ عربی اور ترجمے میں طباعت کی اغلاط ہیں جن کی تصحیح یوں ہے:‘لقد من علی ذاکرة’ میں صحیح ‘ذاکرہ’ہے۔ ترجمے‘الأضبط’کے بجائے الاصبط چھپا ہے جو غلط ہے پھر یہ کہ اصل میں صرف ‘الأضبط’ نام ہے۔ ترجمے میں الاضبط بن قریع السعدی اضافہ ہے۔ یہ عہد جاہلی (ما قبل اسلام) کا ایک شاعر تھا۔

غامدی صاحب اور عہد عباسی کا دیوان الزنادقہ:

آخر میں عرض ہے کہ اگر واقعی غامدی صاحب نے کچھی شیطانی آیات قرآن کے مقابلے میں لکھی تھیں ،تو یہ صریح الحاد ہے۔ اولین عہد عباسی میں جب بغداد میں مجوسی(پارسی)،مانوی اور فلسفیانہ اثرات سے الحاد و زندقہ نے زور پکڑا تو خلیفہ المہدی نے حکومت کا ایک محکمہ‘الزنادقہ’ کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کے عہدیدار ایسے لوگوں سے جو اسلام اور قرآن کے عقائد ،احکام اور اخلاقی اقدار پر طعنہ کرتے تھے ان سے علمی مذاکرات کئے جاتے تھے، اور ان کے شکوک و شبہات دور کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ورنہ ان کو جیل کی سزا دی جاتی تھی یا پھر ضدی اور خطرناک شخص کو سزائے موت بھی دی جاتی تھی جیسے مشہور فاسق و

فاجر اور ملحد شاعر بشار بن برد کے ساتھ ہوا۔

معری کے زمانے میں عباسی خلافت کمزور پر چکی تھی بلکہ پورا شام مصر کے اسماعیلی حکمرانوں کے تحت تھا اس لئے اس کو ایسی کوئی سزا نہیں دی جا سکی۔

سب سے آخر میں ایک اور اہم بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب اپریل میں میرا مضمون غامدی صاحب کی عربی دانی سے متعلق شائع ہوا تھا میرے پاس فوراً سیالکوٹ سے ایک صاحب کا ٹیلیفون آیا تھا۔ جنہوں نے میرے مضمون کے بارے میں اپنی انتہائی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا، اور ساتھ ہی بتایا تھا کہ وہ غآمدی صاحب کو ۱۹۷۳ء سے جانتے ہیں۔ مرید کے سے اور یہ کہ انہوں نے موصوف کو سیالکوٹ بلایا تھا اور انہوں نے دوستوں کی ایک محفل میں قرآن کے مقابلے میں اپنی تصنیف کردہ آیات سنائی تھیں۔ پھر بعد میں وہ موصوف سے لا تعلق ہو گئے تھے۔ تو اس کے پیش نظر اس بات کا انکار ممکن نہیں کہ غآمدی صاحب نے کبھی قرآن کے مقابلے میں کبھی اپنی‘آیات’ تصنیف کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے کچھ معری سے چوری کی تھی ہو سکتا ہے کہ مضمون لکھنے والے واقف راز خاکسار وہی ہوں ۔ مجھے ان کا نام معلوم ہے لیکن چونکہ انہوں نے ظاہر نہیں کیا ہے اس لئے میں

بھی ظاہر نہیں کرتا اور اگر یہ واقف راز کوئی دوسرے صاحب ہیں پھر تو غامدی کی اس ناپاک جسارت پر دو شہادتیں جمع ہوگئیں (بشکریہ 'ساحل')

امام ابن تیمیہ ؒ کی کتاب **''بیان صریح المعقول لصحیح المنقول''** سے اقتباس

گذشتہ صفحہ ۶۵،۶۴ پر دینی امور اور احادیث مبارکہ میں عقل کو کسوٹی بنانے کا اصول ذکر ہوا ہے۔ تاریخ اسلام میں یہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ ؒ کی کتاب ''بیان صریح المعقول لصحیح المنقول'' اس مسئلہ میں ایک معیاری اور حجت کتاب ہے امام ابن تیمیہ ؒ کے مبارک اعمال میں سے اس کتاب کا مطالعہ اہل علم کے لئے انتہائی اہم اور مفید رہے گا۔

مولانا سید ابولحسن علی ندوی ؒ کی تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم میں سے یہ چند صفحات پیش خدمت ہیں جن سے دینی و ایمانی امور میں عقل کی در اندازی کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

عقل کی تعظیم و تقدیس میں مبالغہ

فلاسفہ اور متکلمین دونوں نے مل کر صدیوں عقل کا ایسا آوازہ بلند کیا اور ذات و صفات کے مسائل میں اس کو اس طرح حکم و میزان قرار دیا کہ معلوم ہوتا تھا

کہ وہ ان مسائل میں اس طرح فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ جیسے محسوسات میں ہمارے حواس خمسہ اور عملیات میں تجربہ و استقراء اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ عقل شریعت کے ثبوت کے لئے خواہ شرعیات ہوں، خواہ فقہیات، بنیاد بن گئی۔ اسلام کی ان چھ صدیوں میں کسی مفکر اور عالم نے عقل کی اس غیر محدود فرمانروائی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی جرأت نہیں کی ،حجة الاسلام امام غزالی ؒ نے فلسفہ کے حصہ الٰیات کے خلاف قلم اٹھایا اور اس کو اپنے طنز و تحقیر کا نشانہ بنایا۔ لیکن عقل کی اس مطلق العنان سلطنت اور اس کے دخل درمعقولات کے خلاف انہوں نے بھی کوئی مؤثر آواز بلند نہیں کی۔ امام ابن تیمیہ ؒ (ہمارے علم میں) پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس صورت حال کے خلاف بلند آہنگی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی اور پوری جرأت کی ساتھ یہ ثابت کیا کہ عقائد و حقائق کا اصل ماخذ وحی و نبوت اور کتاب و سنت ہے۔ عقل ان کی مؤید اور مصدق تو ہے، لیکن ان کے ثبوت کی بنیاد نہیں وہ ایک جگہ صاف لکھتے ہیں:

‘‘ان العقل ليس اصلا لثبوت الشرع فی نفسہ ولا معطیالہ صفة لم تکن لہ ولا مفید الہ صفة کمال’’[1]

---

[1] بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول ،حصہ اول ۴۶،

ترجمہ: ‘‘عقل فی نفسہ شریعت کے ثبوت کے لئے اصل کی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ اس کو کوئی ایسی صفت بخشتی ہے جو اس کو پہلے سے حاصل نہ تھی اور نہ اس کو کمال کی صفت عطا کرتی ہے’’۔

عقل کا منصب و مقام

ان کا کہنا یہ ہے کہ عقل صرف معرّف و رہنما ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ رسول کی صداقت و عصمت کے اقرار و اعتراف تک پہنچا دے ،پھر سبکدوش ہو جائے۔ عقل یہ ثابت کر دیتی ہے کہ رسول جو کچھ اطلاع دے اس کی تصدیق اور جو کچھ حکم دے اس میں اس کی اطاعت واجب ہے ،وہ رسول کی صداقت پر عمومی اور مطلق حیثیت سے دلالت کرتی ہے ۔ان کے نزدیک اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی عامی شخص کسی نا واقف کو شہر کے مفتی کے پاس پہنچا دے اور بتلا دے کہ یہ عالم و مفتی ہے پھر اگر اس عامی رہنما اور اس مفتی کے درمیان کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو مستفتی کا بھی فرض ہو گا کہ وہ مفتی کے قول کو ترجیح دے اور اس عامی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ میں نے ہی تو رہنمائی کی ہے۔ اگر میں رہنمائی نہ کرتا تو تم کو اس مفتی تک رسائی کیسے ہوتی(1) وہ لکھتے ہیں کہ رسالت کے علم کے بعد عقل کا کام ہے کہ وہ رسول پر اعتماد اور اس کی اطاعت کرے، جس طرح ہر فن میں صاحب فن کی تقلید کی جاتی

(1) بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول ،حصہ اول ،صفحہ ۷۰

ہے۔ اور بے چون و چرا اس کے مشورے پر عمل کیا جاتا ہے اور اس کے قول کو قول فیصل سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح سے امور غیبیہ احکام و شرائع اور مابعد الطبعیات میں رسول سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا قول قولِ فیصل ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

> جب کسی شخص کو عقل سے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص رسول ہے اور اس کے نزدیک یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی چیز کی خبر دی ہے اور اس کی عقل اس میں کوئی اشکال پیش کرے تو اس کی عقل ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ یہ مختلف فیہ چیز ایسی ہستی پر محول کرے جو اس کے مقابلے میں اس کا زیادہ علم رکھتی ہے اور اپنی رائے کو اس کے قول پر مقدم نہ رکھے۔ اور یہ سمجھے کہ اس کی عقل اس کے مقابلے میں قاصر اور ضعیف ہے ۔اور اس ہستی کو اللہ تعالیٰ کا اور اس کے اسماء و صفات کا اور یوم آخرت کا علم زیادہ ہے جو فرق اس عامی شخص اور ایک پیغمبر میں ہے ،وہ فرق اس سے کہیں زیادہ وہ بڑا ہے جو عوام اور علمائے طب میں ہے۔ پس جب وہ اپنی عقل کے بموجب ایک یہودی طبیب کی بھی اطاعت کرتا ہے اور غذا، شربت ،ضماد (لیپ) اور مسہلات وغیرہ کی جو مقدار اور ترکیب تجویز کر دیتا ہے تو باوجود تکلیف اور مشقت کے وہ اس کی تعمیل کرتا ہے ،محض یہ سمجھ کر کہ یہ طبیب اپنے فن کا مجھ سے زیادہ واقف ہے

اگر میں اس پر اعتماد کروں گا اور اس کے مشورہ کی تعمیل کروں گا تو صحت کی امید ہے باوجود اس کے کہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اطبّاء سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور بہت سے لوگوں کو طبیبوں کی تجویز اور معالجہ سے صحت بھی نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات یہی علاج موت کا سبب بن جاتا ہے اس کے باوجود وہ اس کا قول قبول کرتا ہے اور اس کی تقلید کرتا ہے خواہ اس کا گمان اور اجتہاد طبیب کی تجویز کے مخالف ہو اس سے سمجھنا چاہیئے کہ پیغمبروں کے مقابلہ میں مخلوق کی حیثیت کیا ہے ،پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ کے پیغمبر صادق القول ہوتے ہیں اور إن کو بھی صحیح اطلاع دی جاتی ہے یہ ممکن نہیں کہ إن کی اطلاع خلاف واقعہ ہو اور جو لوگ محض اپنی عقل کی بنا پر ان کے اقوال کا مقابلہ کرتے ہیں ،إن کی جہالت اور ضلالت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے[1]۔

رسول پر بلا شرط ایمان ضروری ہے

جو لوگ عقلیات اور فلسفہ سے متاثر تھے ان کی ذہنی ساخت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ شریعت کی جو بات عقل اور اصول فلسفہ کے مطابق ہوتی اس کو ان کا ذہن قبول کرتا اور جو ان کے اصول و مسلمات کے خلاف ہوتی اس کے قبول

[1] (؟)بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ اول، صفحہ ۸۰

کرنے سے ان کا ذہن قاصر رہتا اور اس میں ہزاروں الجھنیں محسوس کرتے ان میں سے جو لوگ بیباک اور جری ہوتے، وہ صاف انکار کردیتے، اور کہتے کہ شریعت کا مطابق عقل ہونا ضروری ہے یہ بات چونکہ عقل کے خلاف ہے ،اس لئے قابل قبول نہیں جو لوگ اس درجے جری نہ ہوتے وہ اس کی توجیہ کرتے اور بعید سے بعید تاویل سے ان کو باک نہ ہوتا۔امام ابن تیمیہ ؒ نے جا بجا یہ ثابت کیا ہے رسول پر بلا شرط ایمان ضروری ہے،اور رسول کی صحیح حیثیت و منصب یہی ہے کہ اس پر غیر مشروط طریقے پر ایمان لایا جائے اور در حقیقت اسی کا نام ایمان ہے۔ مشروط تصدیق کا نام شریعت کی اصطلاح میں ایمان ہی نہیں ہے وہ لکھتے ہیں:

‘‘ففی الجملة لا یکون الرجل مؤمنا حتی یومن بالرسول ایمانا جازما لیس مشروطا بعدم معارض فمتی قال ا ومن بخبرہ الا ان یظهر لہ معارض یدفع خبرہ لم یکن مؤمنا بہ فهذا اصل عظیم تجب معرفتہ’’[1]

ترجمہ:‘‘خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ رسول پر ایسا قطعی ایمان نہ لائے جس کے ساتھ کسی معارض کے نہ ہونے کی بھی شرط نہ ہو۔ جب وہ شخص یہ کہے گا کہ میں رسول کی اطلاع پر اس وقت تک کے لئے ایمان لاتا ہوں جب تک کہ کوئی ایسا معارض ظاہر نہ ہو جو اس کی اطلاع کی تردید کر دے تو وہ شخص مومن نہیں ہوگا،

---

[1] (?)بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ اول صفحہ ۱۰۱

یہ ایک بہت بڑا اصول ہے جس کا جاننا ضروری ہے’’

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

‘‘دین اسلام سے یہ بات قطعی اور بدیہی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مخلوق پر رسول کی ایسی تصدیق و ایمان واجب ہے جو قطعی اور عمومی ہو جس میں کوئی شرط اور قید نہ ہو اور یہ کہ اس کی ہر اطلاع کی تصدیق کی جائے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اس کے خلاف جو بات بھی ہو گی وہ باطل ہو گی ،جو شخص رسول کی اس بات کی تو تصدیق کرتا ہے جس کو اس کی عقل قبول کرتی ہے اور اس کی اس اطلاع کو رد کر دیتا ہے جو اس کی رائے اور عقل کے خلاف ہوتی ہے اور رسول کی اطلاعات پر اپنی عقل کو مقدم رکھتا ہے ،اور یہ بھی کہے جاتا ہے کہ میں رسول کو سچا جانتا ہوں تو وہ متناقض باتیں کرتا ہے، اور فاسد العقل اور ملحد ہے ،اور جو شخص کہتا ہے کہ میں اس وقت تک رسول کی اطلاع کی تصدیق نہ کروں گا جب تک کہ میں اس کو اپنی عقل سے سمجھ نہ لوں تو اس کا کفر کھلا ہوا ہے[1]

عقل کے ہوائی قلعے

امام ابن تیمیہ ؒ اس کے بعد مدعیان عقل کے اس دعوی کا بھی جائزہ لیتے ہیں کہ عقل و نقل میں اکثر تعارض وتضاد ہوتا ہے اور پیغمبروں نے جن چیزوں کو عقائد و

---

(1) بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ اول صفحہ ۱۰۱

حقائق کے طور پر پیش کیا ہے وہ بعض اوقات صریح عقل و ہدایت کے خلاف ہوتے ہیں اور ان حقائق و مسلمات سے متصادم ہوتے ہیں جو ہزاروں برس کے غورو فکر کا نتیجہ اور فلسفہ کی بنیاد ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ جن عقلیات کو پیغمبروں کی اطلاعات اور کتاب و سنت کے نصوص کا معارض بتایا جاتا ہے وہ اکثر محض توہمات ہیں۔ اور غور کرنے کے بعد عقل کے ہوائی قلعے ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ان کی علمی تنقید اور احتساب کیا جائے اور ان کو قریب سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ محض لفّاظی اور ہوا بندی تھی۔ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں وہ لکھتے ہیں:

‘‘بہت سے وہ عقلیات جن کا یہ مدعیان عقل دعویٰ کرتے ہیں اور اِن کو نصوص کا مخالف بتلاتے ہیں اور امتحان کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ ان میں کوئی حقیقت نہیں تھی یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچوں کا یا بچوں کی طرح نا واقف آدمی کو خالی سوکھی ہوئی مشکیں ہلا ہلا کر اور بجا بجا کر ڈرائے ،جب کبھی معقولات پر پورا غور کیا جاتا ہے اور اِن پر گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود رسول کی اطلاعات کی صداقت کے لئے دلائل و براہین کا کام دیتی ہیں اور یہ کہ اس کی اطلاعات سے جو کچھ لازم آتا ہے وہ سب صحیح ہے اور جس شخص نے اس کی نفی کی ہے وہ محض حقیقت سے نا واقفیت کی بنا پر اور ظاہری اور باطنی طور پر مرعوب ہو کر بالکل جیسے کوئی شخص معبودان باطل سے ڈرجائے اور سمجھے کہ وہ اس کو نقصان پہنچا سکتے

ہیں یا کوئی شخص اپنے ضعف ایمان کی وجہ سے دشمنان اسلام سے جو خود کمزور ہو اور سراسیمہ ہو جائے''[1]۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''یہ لوگ جو فلسفہ کے مہیب و پرشکوہ الفاظ سے إن کی حقیقت کو جانے بغیر مرعوب ہو گئے ہیں إن کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی نامرد دشمن سے محض إن کا لباس اور پوشاک دیکھ کر مرعوب ہو جائے اور اس کو ان کی حقیقت حال دریافت کرنے کی نوبت نہ آئے لیکن جو شخص إن کی حقیقت دریافت کرے گا وہ دیکھے گا کہ وہ خود انتہائی ضعیف و عاجز ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ٹ ٹ ڑ ڑ ڤ ڤ ڦ ڦ ڦ ڦ ڦ ڦ ڄ ڄ''[2] (آل عمران ۱۵۱)

ترجمہ:''ہم جلد ہی ڈا لدیں گے کافروں کے دلوں میں ہیبت کیوں کہ انہوں نے شریک جانا اللہ کا جن کی اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری ۔

اہل دانش کی بے دانشی

وہ کہتے ہیں کہ ان اقوال و تدقیقات پر غور کیا جائے جن پر ان کو بڑاناز ہے اور جن کو انہوں نے الٰہیات کا نام دیا ہے ،اور جن کو ان کے پیرو انبیاء کے کلام کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں، نظر انصاف سے دیکھا جائے کیا اس میں اور دیوانوں کی بے سروپا باتوں میں کچھ فرق معلوم ہوتا

---

[1] بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ چہارم صفحہ ۱۵۳

[2] بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ سوم صفحہ ۱۵۴

ہے؟

‘‘صاحب عقل اِن لوگوں کے کلام کو غور سے دیکھے جو بڑی مہارت اور تحقیق کے مدعی ہیں اور اپنی عقل و دانش سے انبیاء کے کلام کو رد کرتے ہیں ، فلسفے کی چوٹی پر پہونچ کر اور عقل و حکمت کے بلند ترین مقام سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو دیوانوں کی باتوں سے بالکل ملتی جلتی ہیں جو صحیح و حق بات بداہتہً ثابت ہے اس کو رد کرتے ہیں اور جو بے بنیاد اور بے اصل بات جس کا بطلان بالکل بدیہی اور ظاہر ہے اس کو اپنے تلبیس آمیز کلام سے مقبول بناتے ہیں’’۔

صریح عقل اور صحیح نقل میں کبھی تعارض نہیں ہوتا

لیکن امام ابن تیمیہ ؒ عقل کا پورا احترام کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن مجید میں جا بجا عقل سے کام لینے اور اس سے فائدے اٹھانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک صحیح عقل اور صحیح نقل میں کبھی تعارض نہیں ہو سکتا وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے وسیع مطالعے و طویل غوروفکر میں کبھی عقل و نقل میں تعارض و تضاد نہیں دیکھا، لیکن شرط یہ ہے کہ عقل سلیم ہو اور نقل صحیح و محفوظ ہو، اس موضوع پر انہوں نے ایک مستقل ضخیم کتاب بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول تصنیف کی ہے۔جس میں انہوں نے مفصل و مدلل طریقے پر ثابت کیا ہے کہ

معقول و منقول میں پوری موافقت ہے اور جو باتیں وحی و نبوت کتاب و سنت سے ثابت ہو چکی ہیں صحیح و کامل عقل ان سب کی تصدیق کرتی ہے، عقل ہمیشہ ان نصوص و منقولات کی تائید و تصدیق کرتی رہی اور جب بالغ نظری اور دقت نظر سے کام لیا جائے گا عقل کو ان منقولات کی تائید و تصدیق ہی میں دیکھا جائے گا وہ لکھتے ہیں:

> ‘‘صحیح و واضح عقلی دلائل جن میں کوئی شک نہیں ہے بلکہ یقینی فطری علوم سب کے سب انبیاء کی اطلاعات کے موافق ہیں، مخالف نہیں اور صحیح عقلی دلائل تمام تر نقل و روایت(سمع) کے مطابق ہیں ذرا بھی اس کے خلاف نہیں ۔ الحمدللہ میں نے مختلف فرقوں کا کلام اور إن کے مسائل پر غور کیا ہے اور اسی بات کو صحیح پایا ہے۔’’[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ‘‘منقول صحیح کا کبھی معقول صریح معارض نہیں ہوتا میں نے اختلافی مسائل میں بھی اس اصول کی تحقیق کی اور میں نے یہی دیکھا کہ صحیح و صریح نصوص کے خلاف جو کچھ بھی پیش کیا جاتا ہے وہ محض فاسد شبہات ہوتے ہیں جن کا بطلان عقل سے ثابت ہوتا ہے میں نے بڑے بڑے اصولی مسائل توحید و صفات ، مسائل قدرو نبوات وغیرہ کو بھی اس نظر سے دیکھا اور یہی پایا کہ جو صراحتہ عقل سے ثابت ہوتا

---

[1] (?)بیان موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ سوم صفحہ۲۷۲

ہے کبھی سمعیات و منقولات إن کے مخالف نہیں ہوتے بلکہ وہ نقل و روایت جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صریح عقل کے خلاف ہے، تحقیق سے یا تو موضوع حدیث ثابت ہوتی ہے یا اس کی روایت ضعیف ہوتی ہے اس لئے وہ دلیل بنانے کے قابل نہیں ہوتی، ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر إن چیزوں کی اطلاع نہیں دیتے جو عقلاً محالات میں سے ہیں بلکہ إن چیزوں کی اطلاع دیتے ہیں جن میں عقل حیران و سرگشتہ ہوتی ہے، وہ اس چیز کی اطلاع نہیں دیتے جس کی عقل نفی کرتی ہے بلکہ اس چیز کی اطلاع دیتے ہیں جس کی حقیقت سمجھنے سے عقل عاجز رہتی ہے''[1]۔

وہ دعویٰ سے کہتے ہیں (اور إن کا دعویٰ بڑا وزن رکھتا ہے) کہ ایک حدیث یا نقل بھی عقل کے مخالف نہیں اور اگر ایسی کوئی حدیث ہے تو وہ اہل فن کے نزدیک ضعیف یا موضوع ہے ۔

قرآن میں بہترین عقلی دلائل ہیں

ان کو متکلمین و فلاسفہ کے اس دعویٰ کے تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا صحیفہ ہے جس کی بنیاد محض نقلیات و سمعیات پر ہے انہوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں بہترین عقلی دلائل ہیں اور دلائل ایسے محکم مدلل اور واضح الثبوت ہیں جن کو فلاسفہ

---

[1] (?) حصہ اول صفحہ ۸۳

اور متکلمین کے دلائل جو بحث و تنقید کے بعد تار عنکبوت ثابت ہوتے ہیں، پہنچ نہیں سکتے وہ فرماتے ہیں:

‘‘اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے عقلی دلائل بیان فرمائے ہیں جن کی اس علم میں ضرورت ہے، اور یہ فلاسفہ متکلمین اِن کا پورا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، یہ جن دلائل و نتائج کو پیش کرتے ہیں قرآن مجید نے اِن کا خلاصہ بہترین طریقہ پر پیش کر دیا ہے’’[1]۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

‘‘رسول اللہ ﷺ نے اثبات صانع اور اس کی صفات و افعال کی معرفت کے سلسلہ میں دنیا کے سامنے جو کچھ پیش کیا وہ صریح عقل کے مطابق ہے اور عقلاء کی بڑی سے بڑی عقلی بلند پروازیوں سے بلند ہے، اِن اگلے پچھلے فلاسفہ حق و باطل کی تلبیس کے عادی ہیں، اس لئے اس کو سیدھے سیدھے طریقہ پر بیان نہیں کرتے’’[2]

رسول کی تعلیم میں التباس نہیں

فلاسفہ و متکلمین اور ان کے ہمنواؤں کے گروہ میں بہت سے لوگ اس بات کے قائل تھے کہ رسول نے ذوات کے بارے میں پوری تفصیل و تشریح سے کام نہیں لیا، بلکہ ان چیزوں کو مجمل و مبہم طریقہ پر بیان کیا گیا ہے قرآن کا بہت سا حصہ

---

[1] حصہ اول صفحہ ۱۴

[2] حصہ سوم صفحہ ۶۸

شرح کا محتاج ہے ،اور اللہ نے پچھلے دور میں متکلمین کو یہ توفیق دی کہ وہ اس کی شرح و تفصیل کریں اور عقائد و حقائق دینی کو مفصل و مدلل طریقہ پر امت کے سامنے پیش کریں وہ کہتے ہیں کہ رسول کو بلاغ کا حکم تھا ،آپ نے ہر اس چیز کی تفصیل و تشریح کی جس کی تفصیل و تشریح دین کے لئے ضروری تھی ،عقائد و اصول دین کی بنیا دیں اور اللہ کی ذات و صفات جس کے بغیر معرفت اور انسان کی سعادت و نجات ممکن نہیں کیسے مجمل و مبہم چھوڑے جا سکتے تھے؟ جس کتاب کے سمجھنے اور سمجھ کر پڑھنے اور اس پر غور و تدبر کی جا بجا دعوت دی گئی ہے ،وہ اس اجمال و ابہام کی حالت و ابہام کی حالت میں کیسے چھوڑی جا سکتی تھی ،وہ کہتے ہیں:

‘‘رسول نے تبلیغ کا حق ادا کیا اور مکمل و واضح طریقہ پر اللہ کی بات پہنچائی اور اس کے مراد و منشاء کو واضح کیا ،قرآن و حدیث میں اگر کوئی لفظ ایسا ہے جس کے ظاہری معنی نہیں لئے جا سکتے تو یہ ضروری بات ہے کہ رسول نے دوسرے لفظوں سے اس کے معنی و مراد کی تعیین کی یہ ممکن نہیں کہ آپ ایسے لفظ بولیں جس کاظاہری مفہوم و مدلول باطل ہو اور آپ اس کی صحیح مراد بیان نہ کریں اور یہ بات بھی کسی طرح عقل میں نہیں آتی کہ آپ لوگوں سے کلام کے اس مطلب کے سمجھنے

کا مطالبہ کریں جس کی آپ نے اِن سے تشریح نہ کی ہو ،اور جس کی رہنمائی نہ فرمائی ہو محض اس وجہ سے کہ لوگ اس کو اپنی عقل سے سمجھ سکتے ہیں ،یہ حقیقت میں اس رسول پر بہت بڑا اعتراض ہے جس نے اللہ کی بات بے کم و کاست پہنچائی''[1]۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے رسول کو بلاغ مبین کا حکم دیا، اور آپ سے بڑھ کر اپنے رب کا کوئی فرمانبردار اور تابعدار نہیں تھا، تو یہ ضروری بات ہے کہ آپ نے یہ بلاغ مبین پہنچایا ہےاس بلاغ مبین کے ساتھ آپ کے بیان میں التباس و تلبیس نہیں ہو سکتی، باقی جن آیات کے متعلق قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ متشابہات ہیں جن کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا تو یہاں تاویل سے مراد تفسیر نہیں بلکہ اِن کی حقیقت ان کے وقوع کی شکل اور اِن کا مال ہے''۔

امام ابن تیمیہ کی دعوت اور ان کا کارنامہ

غرض یہ کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس بات پر پورا زور دیا ہے کہ عقائد کا ماخذ وحی و نبوت اور کتاب و سنت کو بنایا جائے اور انہی کے نصوص کو اس بارے میں معیار کا درجہ دیا جائے ،انہوں نے ساری عمر اس کی دعوت دی اور مشکل سے ان

---

[1] (؟)حصہ سوم صفحہ ١٠

کی کوئی تصنیف اس سے خالی نظر آئے گی۔ اس طرح انہوں نے فکر اسلامی کو طاقت و تازگی بخشی، جو فلسفہ و علم کلام اور عجمی روح سے بہت کچھ مجروح و مضمل ہو گئی تھی۔۔